

©All rights reserved

Fughan-e-Darwesh

Compiled By:Khushtar Noorani

First edition: 2009

Idara-e-Fikre Islami, Delhi
Distributed by: Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Phone: 011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رئیس القلم علامہ ارشد القادری کے بے لاگ اداریوں کا مجموعہ

فُغَانِ دَرَوِیش

تدوین و ترتیب
خوشتہ نورانی

ادارہ فکر اسلامی، دہلی

انتساب

اپنے چچا

ڈاکٹر غلام زرقانی

کے نام

بچپن میں جن کی سرپرستی میں تعلیمی ایام گزارے

فہرست

۱	پیش لفظ	6
۲	ارباب علم کے تاثرات	10
۳	پہلا جام کوثر	18
۴	دینی امنگوں کا موسم	21
۵	دل کی آگ	26
۶	نہایت مفید جواب	30
۷	حق کی راہ کا کاٹنا	34
۸	خراج عقیدت	36
۹	جام کوثر جدید	39
۱۰	کیا ہم جشن عید منانے کے قابل ہیں؟	41
۱۱	جام نور	44
۱۲	میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر	47
۱۳	بھگی پکوں کے سائے میں	50
۱۴	سجدہ شکر	55
۱۵	عشق کی فتح مبین	58
۱۶	روحانی انقلاب کا موسم	61

۱۷	نازک گھڑی	اگست ۱۹۶۷ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	63
۱۸	ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل	نومبر ۱۹۶۷ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	69
۱۹	جام نور کا دوسرا سال	جنوری ۱۹۶۸ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	78
۲۰	ہندوستان میں مسلم قیادت کا تنقیدی جائزہ	فروری ۱۹۶۸ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	81
۲۱	بھینک مایوسی	اپریل ۱۹۶۸ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	85
۲۲	خطرے کا نشان	اگست ۱۹۶۸ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	88
۲۳	سیوان سے پٹنہ تک	دسمبر ۱۹۶۸ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	92
۲۴	وقت کے تقاضوں سے گریز کب تک؟	فروری ۱۹۶۹ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	100
۲۵	راکھ کے نیچے چنگاری	مارچ/اپریل ۱۹۶۹ء	ماہنامہ جام نور کلکتہ	104
۲۶	سامان عبرت	جولائی ۱۹۷۹ء	پاسبان الہ آباد	107
۲۷	آخری کوشش	ستمبر ۱۹۷۹ء	پاسبان الہ آباد	111
۲۸	دوباتیں	مئی/جون ۱۹۸۵ء	المیزان ممبئی	118
۲۹	ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا	مارچ ۱۹۸۸ء	ماہنامہ رفاقت پٹنہ	126
۳۰	درد کی کہانی زخموں کی زبانی	مارچ ۱۹۸۹ء	ماہنامہ رفاقت پٹنہ	129

پیش لفظ

اردو زبان میں مذہبی رسائل کی تاریخ تقریباً دو سو سال پرانی ہے، اس لمبی مدت میں متحدہ ہندوستان سے بے شمار رسائل و جرائد نکلے، لیکن مقبولیت اور ناموری چند ہی کے حصے میں آئی۔ ماہنامہ جام نور انہی چند رسائل میں سے ایک ہے جس کی شہرت کا آوازہ بلا تفریق مسلک ہر طبقے تک پہنچا ہے۔

ہم نے جب بچپن کی دہلیز پھلانگ کر شعور میں قدم رکھا تو جام نور بند ہو چکا تھا، بلکہ یوں کہہ لیں کہ رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ (۱۹۲۵/۲۰۰۲ء) نے اپنی مختلف دینی و ملی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنی صحافتی زندگی کا ایک روشن باب بند کر دیا تھا۔ اس وقت لوگوں کے دل و دماغ میں 'جام نور' اور 'جام کوثر' کی یادیں ہی رہ گئی تھیں اور خواص کی محفلوں میں ان کے تذکرے۔ حضرت علامہ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے ساتویں دہائی سے کیا اور بساط صحافت عملی طور پر ایک دہائی کے اندر پلیٹ دی۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان انہوں نے کئی رسالے نکالے جن میں کلکتہ سے 'جام نور' اور 'جام کوثر' اور پٹنہ سے 'رفاقت' اور 'شان ملت' قابل ذکر ہیں۔ ان میں اول الذکر دو رسالوں کی انہوں نے براہ راست ادارت و نگرانی فرمائی اور موخر الذکر رسالوں کی صرف نگرانی فرماتے رہے۔

موجودہ دور ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ سائنسی ایجادات نے اس شعبے کو جو سہولت اور ہمہ گیریت بخشی ہے یہ فن اب اختصاص میں داخل ہو گیا ہے، اس کے باوجود آج کوئی بھی کامیاب اخبار یا رسالہ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو، ٹیم ورک اور اسکیرٹائز کا متقاضی ہے اور انہی بنیادوں پر ترقی پذیر بھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ماضی میں صحافتی شعبے کی محدودیت اور تمام

تر مشکلات کے باوجود علامہ ارشد القادری نے تنہا صرف اپنے اسلوب نگارش اور طرز استدلال سے اپنے محلے کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا اور شہرت بھی ایسی کہ ان رسائل کے بند ہونے کے بعد ایک نسل بڑھ کر جوان ہو گئی ہے مگر ان کے تذکروں کے تسلسل نے انہیں ان رسائل سے ناواقف نہیں رکھا ہے۔

کہتے ہیں کہ اردو رسالے کا مدیر، اس کا کاتب بھی ہوتا ہے، کلرک بھی، ناشر بھی اور بندل بردار بھی، یہ بات صحافت کے موجودہ حالات میں کلی طور پر صادق آتی ہو یا نہیں مگر ماضی میں اردو رسائل کے مدیران کا یہی حال تھا، علامہ ارشد القادری بھی اپنی تمام تر مبلغ علمی کے باوجود اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ وہ رسالے کی ادارت بھی فرماتے، ادارے سے متعلق خطوط بھی لکھتے، ممبر شپ کے ریکارڈ کے لیے رجسٹر بھی پر کرتے، اس کی طباعت کے لیے کلکتہ کی تنگ 'چونا گلی' میں پریس کا چکر بھی کاٹتے اور رسالے کی اشاعت کے بعد بندل بنا کر انہیں پوسٹ کرنے کے لیے ڈاک خانے بھی جاتے اور اس کے بد مزاج منشیوں سے مچھے بھی لیتے۔ ان تمام تر مصائب اور پریشانیوں کے ساتھ قلم کی رعنائی اور گلکاری کو برقرار رکھتے ہوئے ادارے اور دیگر کالمز تحریر کرنا اور انہی بنیادوں پر اسے بلندی کی معراج تک پہنچا دینا ان کی غیر معمولی شخصیت کا سراغ دیتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن لوگوں نے دین و ملت کی اشاعت اور ترقی کے لیے ملکی اور عالمی سطح پر کام کیا، ان میں علامہ موصوف کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اس لیے انہیں ایک شخص نہیں ایک 'ادارہ' کہا گیا، جنہوں نے دین و مسلک کی سرخروئی کے لیے پانچ دہائیوں تک ہر میدان میں بازو آزمائے اور اپنی گونا گوں صلاحیتوں کا خراج وصول کیا، خواہ وہ درس و تدریس کا میدان ہو، تصنیف و تالیف کا، تحریر و صحافت کا، خطابت و مناظرے کا، تنظیم و تحریک کا، مدارس و مساجد کے قیام کا یا پھر سیاسی و سماجی مسائل کا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں عالمگیر شہرت ان کے قلم کی بنیاد پر ملی اور اسی حیثیت سے وہ ہر طبقے میں پہچانے بھی گئے، اس لیے کہنے والوں نے کہا کہ "قلم کی ربیسیٹ" ان کے نام کے ساتھ خوب چھتی ہے۔ دینی حمیت، ملی غیرت اور مسلکی درد نے انہیں مختلف محاذوں پر مصروف نہ

کیا ہوتا تو ان کے قلم کی جولانیت تصنیف و تالیف کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کرتی۔

حضرت علامہ نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود دودر جن سے زائد کتابیں تصنیف فرمائی اور دینی، ملی، شرعی اور سیاسی مسائل پر سیکڑوں مضامین ان کے نوک قلم سے نکلے، جو آج قوم و ملت کا ایک بڑا دینی و علمی سرمایہ ہے۔ ضرورت ہے ان کی بکھری ہوئی دیگر تحریروں کو بھی یکجا کر کے قوم کے سامنے لایا جائے تاکہ زمانہ ان تحریروں سے ذہنی، فکری، علمی اور سیاسی شعور حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمارے چچا محترم مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی (امریکہ) نے پیش رفت کی ہے اور مقام شکر ہے کہ اب تک حضرت علامہ کے بین الاقوامی سفر ناموں، شعرو سخن، خطبات استقبالیہ، شخصی خاکوں، قصص و روایات اور رضویات پر مشتمل مجموعے کتابی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ بلاشبہ ان کتابوں کی ترتیب و تدوین میں انہیں جو مشکلات درپیش ہوئی ہوں گی کلمات تبریک ان کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اسی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے "فغان درویش" جو حضرت علامہ کے اداروں کا مجموعہ ہے، جنہیں انہوں نے چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں اپنے رسائل جام نور، جام کوثر اور رفاقت میں تحریر فرمایا، اس کے علاوہ موصوف کی کچھ ایسی بھی تحریریں تھیں جنہیں دیگر رسائل نے اپنے ادارتی کالم میں شائع کیا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ زیر نظر کتاب میں علامہ کے تمام ادارے شامل کر لیے گئے ہیں، کیونکہ کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی 'جام نور'، 'جام کوثر'، 'رفاقت' اور 'شان ملت' کی تمام فائلیں ترتیب وار دستیاب نہ ہو سکیں، افسوس کہ زمانے کی دست برد نے انہیں محفوظ نہیں رکھا۔

جہاں تک زیر نظر کتاب میں شامل اداروں کی افادیت کی بات ہے، یقیناً یہ اپنے اندر ایک جہان معانی کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ درد و کرب میں لکھی ان تحریروں کو اگر تنہائی میں پڑھا جائے تو ان میں ایک ایسے درویش کی تصویر ابھرے گی جو ملت کی بے اعتدالی، عیش کوئی اور تساہلی پر نوحہ زن ہے، مذہب و مسلک کی توسیع اور ارتقا کے لیے بے کل ہے، تحریر و صحافت کی ناقدری پر شکوہ بہ لب ہے، جماعت کی لامرکزیت اور تنظیم و تحریک کے فقدان پر گرہیں کناں ہے اور حکومت وقت کی مسلم اقلیتوں سے بے اعتنائی اور تعصب پر مضطرب ہے۔

ان مسائل سے آج بھی جماعت اور ملت دوچار ہیں اس لیے ان تحریروں کی دوبارہ اشاعت بے معنی نہیں کہی جاسکتی کہ جذبوں کی برائیختگی، فکر و نظر کی درستی، اخلاص کی طہارت اور اپنے حقوق کی بازیافت کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کل تھی۔

خوشتر نورانی

نومبر ۲۰۰۹ء

ارباب علم کے تاثرات

احسن العلماء علامہ سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں (سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ)
”جام نور“ کے اسلوب تحریر اور طرز استدلال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کفر کو ٹپا
تڑپا کر قتل کرتا ہے لیکن قلم کی تلوار پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آتا۔

مجاہد ملت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمن صاحب (اڑیسہ)

ہندوستان کے مرکزی شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی وغیرہ میں اہل سنت کا کوئی پرچہ نظر نہیں آتا
تھا جس کی اشد ضرورت تھی اور نہ ہونے سے دینی سخت نقصان۔ کم از کم کلکتہ میں آپ نے
اہل سنت کا ایک پرچہ جام کوثر جاری کیا جس سے بڑی خوشی ہوئی۔

باری عزوجل اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام و بطیفیل حضرت غوثا البجلانی رضی
المولیٰ تعالیٰ عنہ وارضاه عنا وافاض علینا من برکاته فی الدارین آپ کے
پرچے کو تمام ہندوستان خصوصاً کلکتہ اور مضافات میں دینی خدمت انجام دینے کی بیش از بیش
توفیق مرحمت فرمائے اور کلکتہ ایسے مرکزی شہر میں کوئی ایسا اپنا عالم دین مستقل موجود رہے جو
صاحب قلم اور صاحب زبان ہو، جس سے اس قسم کی دینی خدمتیں اطمینان کے ساتھ انجام
پاسکیں، اس کی اشد ضرورت تھی۔ بجزہ تعالیٰ اس عزیز میں اس کی صلاحیت باحسن وجوہ پائی جاتی
ہے۔ مسلمانان اہل سنت سے خصوصاً کلکتہ اور مضافات کے سنی مسلمانوں سے فقیر کی گزارش
ہے کہ جام کوثر کی ہر ممکن امداد، نہ صرف اس لیے کریں کہ یہ محض اہل سنت کا ایک پرچہ ہے بلکہ
اس کی نیت بھی رکھیں کہ جہاں اس پرچے سے دینی خدمات انجام پائے گی وہاں اس کے
ذریعہ ہمارے مرکزی شہر کلکتہ میں ایک اعلیٰ صلاحیت کا عالم بھی ہر وقت موجود رہے گا۔

اس کے صرف موجود ہی رہنے سے بے دینی کے بہت سارے فتنے خود بخود مٹ جائیں گے اور خدا نخواستہ جو سراٹھائیں گے، اس کی باحسن وجوہ مدافعت ہو سکے گی۔
اس کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں، جتنی نیتیں کریں گے اتنا ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ ارشاد حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے ”انما الاعمال بالنیات“۔ ولکل امرئ ما نوى“ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ”نية المومن خير من عمله واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔“

برہان ملت علامہ شاہ مفتی برہان الحق صاحب جملپوری

’شمع رو جام کوثر‘ (۱۳۸۶) کے صرف دو شمارے نمبر ۱ اور نمبر ۳ فقیر کے نظر نواز ہوئے۔ فقیر تین ماہ سے علیل ہے۔ دوران عرس قدس شدید بخار اور داہنے حصہ میں عرق النساء اور نفقرس کے سبب چلنا پھرنا دشوار، کئی بار اظہار خیال کے لیے قلم لیا۔ دو سطر لکھیں، رکھ دیا۔ انتظار رہا کہ ’مونس غم جام کوثر‘ (۱۹۶۶ء) کے دوسرے نمبر اور بعد کے شمارے بھی شرف مطالعہ بخشے۔ بہر حال آسمان صحافت پر نقوش رشد و ہدایت (۱۳۸۶ھ) کے ماہ تابان صورت جام کوثر (۱۹۶۶ء) کا طلوع کلکتہ جیسے مرکزی مگر ابر آلود شہر پر ایک اعجاز سنت و سنیت ہے۔ اس مبارک رسالہ کے عنوانات نہایت دل کش اور ہر عنوان کے تحت اس کی مناسبت سے ترتیب مضمون ارشاد کی فصاحت و بلاغت کا نمایاں نمونہ ہے۔

مستقل عنوانات ’تعزیرات قلم‘، ’بزم دانش‘، ’محفل حرم‘، ’بزبان حکایت‘، ’سیر گلستاں‘، ’قلمی جائزے‘ کس قدر دل آویز عنوانات ہیں۔ ہر عنوان اپنے مضمون کے ساتھ ایسی جاذبیت رکھتا ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے نظر ہٹنا ہی نہیں چاہتی۔ معاندین اہل سنت کی جس ملیحانہ انداز میں سرکوبی کی ہے، یہ ارشاد ہی کا انداز فکر ہے۔ تشنگان بادہ سنیت و متلاشیان نصح و وقائع و ارشادات اہل سنت اپنے قلوب کو طراوت جام کوثر (۱۳۸۶ھ) سے تازہ رکھنے اور مہینہ میں دوبار تازہ بہ تازہ نو بدقائق و حقائق سے معلومات کو وسیع کرنے کے لیے اس کے معاون بنیں اور بے سرو پا لایعنی فلمی قصہ کہانیوں کے رسائل میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کرنے کی بجائے اس دینی، مذہبی، معاشرتی، ثقافتی، ادبی پندرہ روزہ رسالہ

مولانا ارشد القادری کے ہدیہ بے نظیر جام کوثر (۱۳۸۶) کو پڑھ کر اس کے بہترین طرز تحریر اور مضامین نادر جام کوثر (۱۹۶۶) سے خود نفع اٹھائیں اور جام کوثر کو نفع پہنچائیں۔

حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب (سربراہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)

آپ کا جام کوثر جمشید پور میں ملا تھا۔ جام کوثر کے متعلق یہ عقیدہ تھا اور ہے کہ ایک ہی جام پی کر پیاس ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی، مگر یہ آپ کا جام کوثر وہ ہے، جس نے بے پناہ تشنگی بڑھا دی۔ جی چاہتا ہے کہ اس کو پندرہ روزہ نہیں، ہفتہ وار نہیں، روزانہ بھی بار بار پیا جائے۔ یہ جام کوثر اپنی صوری و معنوی خوبیوں میں آپ اپنا نظیر ہے۔ پہلا ہی قدم اتنی بلندی پر ہے کہ چاروں طرف سے متوالے لٹ پڑے۔ ہاتھوں ہاتھ لے گئے، جو پڑھتا ہے پرچہ دینا نہیں چاہتا، بدشواری ایک پرچہ مبارک پور تک لایا، بحفاظت اپنے پاس رکھا، مگر حضرت مولانا شاہ غلام آسی صاحب نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ امید ہے کہ وہ اس سے جام کوثر کا کچھ کام ہی کریں گے، لیکن میں بے جام ہی رہ گیا، چاہتا ہوں کہ سب پرچہ اپنے پاس محفوظ رکھوں۔ میرا دلی منشا اور قیمتی مشورہ ہے کہ مسلمان اس کو اسی طرح اپنائیں۔ جام کوثر ہر مسلمان کے گھر میں رہے اور ہر پرچہ محفوظ رہے۔

بفضلہ تعالیٰ آپ صاحب قلم، صاحب لسان ہونے کے ساتھ پیکر ایثار و اخلاص ہیں پھر جام کوثر کے ثبات و دوام میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ صرف استقلال کی ضرورت ہے، مولیٰ تعالیٰ کرامت فرمائے۔ جام کوثر کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائے، بام عروج و ترقی کی انتہائی منزل پر گامزن فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ علی آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

علامہ شاہ سراج الہدیٰ صاحب قادری (مدرسہ اہل سنت عین العلوم، گیوال بیکھ، گیا)

حسن اتفاق دیکھیے! ادھر میں نے قادری سرکار کے متوالوں کو آواز دی۔

چلو سودائیو کیا کر رہے ہو دشت ویراں میں

مبارک باد جنت لٹ رہی ہے کوئے جاناں میں

ادھر سے آپ کہتے نکلے۔

پلا دے آج کہ مرتے ہیں رندائے ساقی

یہ کیا ضرور کہ جلسہ ہو حوض کوثر پر

اور جام کوثر کا تیسرا دور چلنے لگا۔ گنبد خضرا سے نور کے ترشح نے نہایت پر کیف سماں پیدا کر دیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس روح پرور نظارے کو دیکھنے کے لیے بام فلک سے ستاروں کی انجمن جھانک رہی ہے۔ سورج، چاند، اس نور کی بارش میں نہانے کے لیے زمیں پر اتر پڑے ہیں۔

مولیٰ تعالیٰ اس کو ہمیشہ جاری رکھے اور آپ کو استقلال و یکسوئی کی دولت عطا فرمائے۔ میں اپنے احباب کی پوری دنیا سے اپیل کرتا ہوں کہ پہلی فرصت میں جام کوثر کے خریدار بن جائیں۔

مولانا محمد میاں کامل سہرامی صاحب (مدرسہ خیر نظامیہ، بارہ دری، سہرام)

اس وقت جام کوثر کا دوسرا شمارہ بہار نظر ہے۔ ادارہ آپ نے احقاق حق کی اس منزل سے لکھا ہے جس کے تصور ہی سے صحافت کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ شاید یہی وہ منزل ہے جہاں گرایت کی ابتدا ہوتی ہے۔ کہنے دیجیے کہ ”اداریہ“ آپ کی فکری عزیمت کا بے غبار آئینہ ہے۔ پھر ”تعزیرات قلم“ کے تحت مدیر تجلی پر جو فرد جرم عاید ہوئی ہے وہ ان کی مجرمانہ ذہنیت کی بھرپور نقاب کشائی ہے۔ کوئی تاویل بھی اس قلمی آوارگی پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔

ساتھ ہی ”مجلس مشاورت“ کا تعارف آپ نے جس طرح ایک لفظ ”شاندار استقبال“ میں کرایا ہے، واللہ اس سے جامع تعارف ناممکن تھا۔ اس اجمال نے ماضی کے سال ڈیڑھ سال کی پوری تفصیل سامنے رکھ دی ہے۔ مختصر یہ کہ ابتدا سے انتہا تک ہر سطر کوثر و تسنیم سے دھلی اور زمزم و سلسبیل میں بسی ہوئی ہے۔

مولانا! یہ ایک نیاز مند کا قصیدہ مدحیہ نہیں بلکہ جذبہ بے اختیار ہے جس نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔ اس احساس و تاثر کے ضمن میں یہ بات از خود آگئی کہ اس سلسلہ میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔

علامہ سید شاہ غلام جیلانی میرٹھی صاحب (صدر المدرسین مدرسہ اسلامی عربی، میرٹھ)

’جام کوثر‘ پہنچا، مطالعہ کر کے بہت مسرت ہوئی۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صدقے میں ”حمایت اخلاص“ و ”جذبہ استقلال“ کے ظل کو داہم رکھے۔ آمین۔

مجاہد دوراں مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی (کچھوچھو شریف)

’جام کوثر‘ نظر سے گزرا، لوہا تو آپ کے قلم کا پہلے ہی سے مانتا ہوں، لیکن اب اعتراف کرتا ہوں کہ آپ اپنے قلم سے انقلاب بھی لاسکتے ہیں۔ میں اپنے تمام ممکن وسائل کے ساتھ ’جام کوثر‘ کو ملک گیر بنانے کی کوشش کروں گا۔

فاضل تورات وانجیل مولانا سید شاہ قائم قتل دانا پوری (شاہ ٹولی، دانا پور، پٹنہ)

آخر خجائنہ روم میں کوثر کو وہ ابال آیا کہ جام سے بھی سنبھلنا دشوار ہو گیا، ایسا چھلکا کہ نہ صرف بنگال ہی جل تھل ہو گیا بلکہ قطروں نے گوہر شہوار کی طرح بکھر کر سارے ہندوستان کو پر کیف بنا دیا۔ عقل و ہوش تو پہلے ہی صفحے میں جواب دے گئے۔ ٹائٹل وہ جاذب نظر کہ صلی اللہ، نقاط امواج کی وہ دلکش صورت کہ سبحان اللہ کہ دیکھتے ہی ایک چوٹ لگی، آنکھیں بھر آئیں۔ کیا کہوں کیا یاد آیا صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے سوالات کے کیا برجستہ جواب دیے ہیں۔ امید ہے کہ اصحاب نیچر بھی اس چشمنے سے سیراب ہوں گے۔

دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جام کوثر کو زلف معشوق کی طرح لمبی عمر عطا فرمائے۔

علامہ مفتی عبدالرشید صاحب (جامعہ عربیہ اسلامیہ، ناگپور)

جام کوثر ملا دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے حبیب مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے میں جلد تر اسے ترقی کی انتہائی منزل پر گامزن فرمائے اور آپ کی ذات سے اسلام و مسلمین کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے، آمین۔

مفتی اشفاق حسین نعیمی صاحب (دارالعلوم اسحاقیہ، جودھ پور، راجستھان)

آپ کا ’جام کوثر‘ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ہم لوگوں کو ہمیشہ سیراب کرتا رہے اور اسے دن دوئی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

حضرت خواجہ نظام الدین بدایونی (بدایوں شریف)

’جام کوثر‘ کو پڑھ کر بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا

یوں نظر آئیں گے خواجہ حشر میں ان کے غلام

چشم ساقی کا تصور ’جام کوثر‘ ہاتھ میں

قاری محمد یحییٰ اعظمی (ناظم اعلیٰ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)

کوثر کا پہلا جام ملا، تشنگان معارف دوسرے جام کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ مولائے کریم آپ کے بلند حوصلوں کے مطابق اس کو پروان چڑھائے، قوم میں جذبہ ایثار پیدا کرے تاکہ دین و ملت کی بیش از بیش خدمات انجام پاسکیں، آمین۔ جام کوثر صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے آنکھوں میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

حکیم سید محمد یونس حبیبی (ایڈیٹر: ماہنامہ شفاء الملک کلکتہ)

”جام کوثر“ فروغ نظر ہوا۔ کلکتہ کی سرزمین پر مذہبی رسالے کی اشد ضرورت محسوس کی جاتی تھی آپ نے اسے پورا کر کے باشندگان کلکتہ پر عظیم احسان کیا۔ یہ رسالہ تشنگان علم و فن کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے، ان خوبیوں کے باوجود، گرانی کے لحاظ سے قیمت بہت کم ہے۔

مولانا ابوالیث اعظمی

”جام کوثر“ کی ظاہری دیدہ زیبی اور باطنی خوبیاں دیکھ کر دل شاد ہوا۔ مضامین بہر اعتبار بلند اور معیاری ہیں۔ میری طرف سے یہ شعر قبول کیجیے

اے ذوق جستجو تری ہمت پہ آفریں

منزل کو ہر قدم پہ قرین تر بنا دیا

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی (گھوسی ضلع اعظم گڑھ)

جام کوثر کا پہلا شمارہ اپنی تمام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو کر دیدہ و دل کے لیے نشاط سرمدی کا باعث ہوا۔ دور حاضر کے پیدا کردہ مادی و الحادی افکار و نظریات کی ناقابل ابطال و تردید اور مذہب کے نام پر چلائی جانے والی دوسری فریب کا رانہ تحریکات کا بے باکانہ تجزیہ جام کوثر کا طرہ امتیاز ہے۔

آپ کے رشحات قلم پر جب بھی نگاہ پڑی دل سے بے اختیار صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی۔ وقت نے اجازت دی تو ان شاء اللہ آئندہ آپ کے ”جواب نامہ“ کے بعض حصوں سے پیدا شدہ شکوک اور چند دینی مسائل کا عقلی حل دریافت کرنے کی جسارت کروں

گا۔ جام کوثر کا فیض دیکھیے کہ ارتجالا یہ قطعہ موزوں ہو گیا، ملاحظہ فرمائیے:

مئے گلرنگ سے لبریز ہے جام کوثر کیف انگیز و طرب خیز ہے جام کوثر
بخشا فکر و نظر کو ہے طہارت کا سرور روش بادہ گل ریز ہے جام کوثر
مولانا محمد سعید اعجاز (کامٹی، ناگپور)

جام کوثر — اسم با مسمیٰ، عنوانات پر کیف، مضامین سرور آگیں، سنیت کا علمبردار، مذہب و ادب کا حسین امتزاج، مدیر اعلیٰ کی توانائی فکر و نظر کا آئینہ دار، بالخصوص ”تعزیرات قلم“ اور ”ہماری ڈاک“ کا انداز نگارش، بے نیاز تحسین!

مستقل عنوانات کی ہمہ گیری دیکھ کر یقین ہے کہ رسالہ کی مقبولیت و شہرت بہت جلد ان شاء اللہ ملک گیر ہو جائے گی۔ میرا یہ شعر دل کے تاثرات کا آئینہ دار ہے۔

یہ جام کون سا ہے اے چشم مست ساقی

پینے سے بڑھ رہا ہے احساس تشنگی کا

ڈاکٹر نظام الدین نظام جونپوری

’جام کوثر‘ کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کے اجلے اجلے شہ پارے، صاف ستھرے مضامین، دلکش مقالے اور مفکرانہ خیالات لائق ستائش ہیں۔ خدا آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔
مولانا ظہیر الدین قادری (ایڈیٹر ہفت روزہ ’استقامت‘، کانپور)

پندرہ روزہ ’جام کوثر‘ کا افتتاحی شمارہ موصول ہوا، سچ جانیے بے پناہ مسرت ہوئی۔ ’جام کوثر‘ اپنی جماعت کا ممتاز جریدہ ہے۔ ٹائٹل کی جاذبیت، مضامین کی ترتیب نیز اپنی جماعت کی تبلیغی سرگرمیاں جس طور سے پیش کی گئی ہیں، جریدہ ہذا کا منفرد انداز ہے اور مستقبل کے تابناک ہونے کا اعلان بھی۔ ادارہ استقامت کی تمام تر خدمات بحق جام کوثر وقف ہیں۔

امین شریعت مفتی محمد انیس عالم سیوانی (دارالعلوم حیدریہ معینیہ، سیوان)

اب تک کوثر کے تین جام ملے، پہلے ہی جام نے اتنا بے خود و سرشار کر دیا کہ ہدیہ تبریک و تحسین کی پیشی میں بھی تعویق ہو گئی۔ ’جام کوثر‘ سے نگاہوں میں ضیا، دل میں فرحت نور اور دماغ میں سرور و نصیب ہوا، مگر تشنگی بڑھ گئی۔ سرور خمار کا مطالبہ ہے کہ جام پر جام ملتا رہے،

ساتی کے کرم سے یہ دور چلتا رہے۔ صحافتی، ادبی، دینی، مذہبی بہر حیثیت جام کوثر کا معیار بلند اور مستحق تحسین و ستائش ہے۔

تبصرہ ماہنامہ ”ماہ طیبہ“ کوٹلی لوہار ان، سیالکوٹ (پاکستان)

سواد اعظم اہل سنت کا ترجمان پندرہ روزہ جام کوثر، حال ہی میں کلکتہ سے جاری ہوا ہے اور اس کا پہلا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ ہیں، جن کے زور قلم نے اس جریدہ کو واقعی جام کوثر بنا دیا ہے۔

دیگر عنوانات کے علاوہ مستقل عنوان بزم دانش، تعزیرات قلم اور محفل حرم پڑھنے کے قابل ہیں، ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت علامہ ارشد القادری کی زیر ادارت جام کوثر کا حلقہ بہت جلد وسعت حاصل کرے گا۔

پہلا جام کوثر آپ کے ہاتھوں میں

پوچھا کہ پاؤں کیوں نہیں پڑتے زمین پر

بولی صبا کہ آتے ہیں ان کی گلی سے ہم

کسی چیز کی لگن بھی کیا قیمت ہوتی ہے۔ یہ ظالم طوفانوں کی طرح اٹھتی ہے اور صحراؤں، خارزاروں، وادیوں اور پہاڑوں کو روندتی ہوئی اپنی منزل پہ جا کر دم لیتی ہے۔ ایک سال پہلے جام کوثر کا خیال بھی اچانک ایک آرزو کی طرح دل میں پیدا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد یہی آرزو ایک سلگتی ہوئی چنگاری بن گئی۔

پھر شوق کی تپش بڑھی، بڑھتی چلی گئی، قدم اٹھے تو راہ میں کانٹوں کی برچھیاں کھڑی تھیں۔ ہاتھ بڑھایا تو اسباب کا دروازہ مقفل تھا، نظر اٹھائی تو امیدوں کے چراغ بجھ چکے تھے، آگے بڑھے تو مشکلات نے دامن کھینچا، ہر طرف تیرگی ہر طرف یاس کا اندھیرا، ٹھوکر لگی، گرتے گرتے حوصلوں نے سہارا دیا، ہمت نے بازو تھامے، یقین نے شمع جلائی، شوق نے راستہ دکھایا، امنگوں نے کانٹے ہٹائے اور عزم کا قافلہ پھر آگے بڑھا، برھتا گیا، بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اب وہ منزل پر ہے اور تشنہ آرزو نہیں ہے، ”جام کوثر“ ہاتھوں میں ہے۔

لو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا آج کچھ اور بڑھادی گئی قیمت میری قدرتی طور پر یہ جاننے کی خواہش ہر شخص کو ہوگی کہ ”جام کوثر“ کن ارادوں کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ مسلمانان کلکتہ اور مضافات کے لیے تو یہی ایک جواب کافی ہے کہ آپ کا فرض کفایہ ادا کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ کلکتہ کے صحافتی افق پر، سیاسی، ادبی، فلمی، جاسوسی، طبی، تفریحی اور تعلیمی، بیسیوں طرح کے اردو روزنامے، ماہنامے، ہفتہ وار،

اخبارات و رسائل نظر آتے ہیں، نظر آتے رہتے ہیں، لیکن غریب ”مذہب“ کو یہاں کی صحافتی دنیا میں اب تک کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے۔ اگر کسی شہر کے ”پریس“ کو دیکھ کر وہاں کے ذہنی اور فکری رجحانات کا اندازہ لگانا صحیح ہے تو کیا یہاں کا پریس ہماری مذہبی بے حسی اور دینی امنگوں سے ہماری بے کیف زندگی کی پردہ دری نہیں کر رہا ہے؟ اس سوال پر چند دوستوں نے یہ کہہ کر ہمارا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی کہ مذہبی تسکین کی یہ ضرورت ملک کے دوسرے شہروں سے پوری ہو جاتی ہے۔ مقصود، مذہبی مطالعہ ہے اور یہ کسی خاص شہر سے مذہبی رسائل کے اجرا پر موقوف نہیں۔

میں نے عرض کیا سوچنے کا یہی انداز، سیاسی، ادبی، فلمی، جاسوسی اور تفریحی اخبارات و جرائد کے حق میں کیوں نہیں ہے؟ صحافت کے ان اصناف میں کیوں کسی خاص شہر کا خلا محسوس کیا جاتا ہے؟ اس باب میں بھی ملک کے دوسرے شہروں کے پریس پر کیوں نہیں قناعت کر لی جاتی؟ آخر مقصود مطالعہ ہے۔ خالی جگہوں کا پر کرنا نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو ماننا پڑے گا کہ مذہب کے باب میں ہماری سردمہری نقطہ انجماد کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو کچھ عرصے کے بعد دیکھتے ہوئے انگارے بھی ہماری رگوں کی تپش واپس نہیں لاسکیں گے۔ یوں بھی ہم پامال راستوں کی ٹھوکر بن چکے ہیں، زندگی کی حرارت کھودینے کے بعد تو ہمارا غبار بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔

مسلمان جب تک ”اسلام“ نام کے ایک مذہب کی طرف منسوب ہے، اس کی ہستی کا عروج و زوال مذہب کے عروج و زوال سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ فکر و نظر کا یہ ایک کھلا ہوا تضاد ہے کہ مذہب سسکتا رہے، مسلمانوں کو مسکراتے دیا جائے۔ مذہب شاہراہوں پہ پناہ گیر ہو، مسلمان ایوانوں میں داد عیش دیں، مذہب کا اعزاز رخصت ہو جائے، مسلمان معزز کہلائیں اور یہ بھی اسی تضاد کا ایک دوسرا رخ ہے کہ مذہب مسند اقتدار پر ہو اور مسلمان ذلتوں کی خاک پر تڑپیں، مذہب بلند یوں پر چڑھ کے آواز دے اور مسلمان قدموں کے نیچے پامال ہوں، مذہب آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کا چراغ بن جائے اور مسلمان خانہ فروشی کی زندگی گزاریں۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

مذہب کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی کا یہی رابطہ استوار کرنے کے لیے ”جام کوثر“ منظر عام پر آیا ہے۔ اخیر میں ہم کلکتہ، ہوڑہ اور چٹکل ایریا کے اپنے ان تمام معاونین و احباب کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جن کے اشتراک و تعاون سے ”جام کوثر“ نکل رہا ہے، اس کے اراکین قابل صد ستائش ہیں کہ انہوں نے کلکتہ کو ایک نئے اعزاز سے سرفراز کیا۔

”جام کوثر“ کا یہ نقش اول ہے، اس میں ترتیب مضامین، کتابت اور طباعت کی بہت سی خامیاں ہوں گی۔ آئندہ ہماری کوشش جاری رہے گی کہ ہم اسے بہتر سے بہتر حالت میں پیش کریں۔ اپنے علماء، اساتذہ، احباب اور اصحاب قلم حضرات سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہمیں اپنے مفید مشوروں اور گرانبغا اثرات سے نوازیں گے۔

یہ ہے دامن، یہ ہے گریباں، آؤ کوئی کام کریں

موسم کا منہ تکتے رہنا، کام نہیں دیوانوں کا

(پندرہ روزہ جام کوثر، کلکتہ، اگست ۱۹۶۶ء)

دینی امنگوں کا موسم

گیارہویں شریف کا مبارک مہینہ اپنے آخری دور سے گزر رہا ہے۔ قدرتی طور پر اس موسم میں مسلمانوں کا مذہبی ولولہ جاگ اٹھتا ہے۔ علم و عرفان کی ملک گیر بارش سے شہر شہر، نگر، نگر، جل تھل ہو جاتے ہیں اور دلوں کی سرزمین نم ہو کر پھر کاشت کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ بھی قدرت کا ہی ایک فیضان ہے کہ بغیر کسی اہتمام اور منظم کوشش کے ہندوستان کے اسی فیصدی مسلمان اس موسم میں دین کے پیغامات سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ عوامی دنیا کو اسلام کے ساتھ مربوط رکھنے میں اس موسم کا نہایت درخشاں ماضی رہا ہے اور نصیب داستاں بہار کے یہ دن سلامت رہ گئے تو مستقبل بھی مایوس کن نہیں ہے۔

صرف اس وجہ سے کہ حضور غوث الوری رضی اللہ عنہ کی سرکار میں ایصال ثواب اور خراج عقیدت کے طور پر لاکھوں لاکھ تحفیں ملک کے اندر منعقد ہوتی ہیں، ان کے ظاہری اور باطنی مفاد سے چشم پوشی سخت قسم کی تنگ نظری ہے۔ مان لیا کہ محفلوں سے اٹھ کر سب کی زندگی سانچے میں نہیں ڈھل جاتی ہے، لیکن دس فیصدی افراد بھی اگر اسلام کی آواز سے متاثر ہو گئے تو اجتماعی طور پر دین کا یہ نفع بھی کیا کم ہے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی فرض کر لیں کہ عمل کا خانہ ایک دم ہی خالی رہا جب بھی فکری طور پر مذہب کے ساتھ یہ ارتباط ہی بجائے خود بہت بڑی چیز ہے۔

مذہبی شخصیتوں اور مذہبی روایات کے ساتھ دلوں کا رابطہ اگر ٹوٹنے سے محفوظ ہے، تو آج نہیں کل عمل کی اصلاح متوقع ہے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ ذہن ہی باسی ہو گیا تو عمل کی اصلاح تو بعد کی چیز ہے، ایمان ہی کی طرف پلٹنا مشکل ہے۔ گیارہویں شریف کی روایات

کے خلاف ”جہاد“ کرنے والے اس رخ سے کیوں نہیں حالات کا مطالعہ کرتے کہ مذہب کے ساتھ دلوں کے تعلق کا سوا اس کے اور کیا ذریعہ ہے کہ مذہبی شخصیتوں اور مذہبی روایات کے ساتھ دلوں کی وابستگی برقرار رکھی جائے۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ عوام کا دینی ذہن نظریات اور فلسفوں سے نہیں اللہ والوں کی زندگی سے متاثر ہوا ہے اور وہ جب بھی متاثر ہوگا اسی راہ سے ہوگا۔

جام کوثر کا خیر مقدم:- جام کوثر کا پہلا شمارہ دو ہزار کی تعداد میں طبع ہوا تھا۔ مذہبی پرچوں کی تاریخ میں شاید یہ پہلی مثال ہوگی کہ شام و سحر میں وہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور وہ بھی صرف کلکتہ، ہوڑہ اور مضافات کے مسلمانوں میں۔ ہمیں نہایت افسوس ہے کہ سینکڑوں شائقین کو دفتر سے محروم واپس لوٹنا پڑا اور ہم انہیں پرچہ نہیں دے سکے۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ہم اس کا لحاظ رکھیں گے۔ جمشید پور سے ایک ہزار پرچوں کی فرمائش آئی ہے۔ خدا کرے اس مرتبہ کسی کو شکایت نہ رہے۔ اس سلسلے میں ٹکلیہ پاڑہ، ہوڑہ اور کمرہٹی کے زندہ دل مسلمانوں کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جنہوں نے جذبہ شوق میں دس دس اور پانچ پانچ روپے میں ایک ایک کاپی خریدی۔

”جام کوثر“ کی غیر معمولی مقبولیت سے لوگوں کی مذہبی پیاس کا اندازہ ہوتا ہے، جو لوگ مذہبی پرچوں کے بارے میں کساد بازاری کا گلہ کرتے ہیں، جام کوثر ان کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ ہزار جمود پر بھی اس ایٹمی دور میں مذہب کی توانائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو لوگ مذہب کی طرف سے منہ پھیر لیں، زندگی کا کوئی اور چشمہ تلاش کرتے ہیں، انہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ انہیں معلوم کرانا چاہتا ہوں کہ مذہب کی حقیقتیں مصنوعی نہیں ہیں، کائنات فطرت کے دوسرے رخ کا نام ہی مذہب ہے۔

یوم آزادی:- آج یوم آزادی ہے۔ آج ہی کے دن ہندوستان برطانوی سامراج کی گرفت سے آزاد ہوا تھا اور پر جوش امنگوں کے سائے میں ایک نئے مستقبل کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جب کہ اس سے چند ہی گھنٹے پیشتر ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ تقسیم ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے مسائل کے حل کے طور پر عمل میں آئی تھی۔ انیس سال کی

مدت گزر گئی لیکن یہ سوالیہ نشان اب تک ذہنوں میں موجود ہے کہ کیا تقسیم سے اقلیت کے مسائل حل ہو گئے؟

یہ سوچنے کی ذمہ داری ہم سے زیادہ ان کی ہے جن کے ہاتھوں میں ملک کا انتظام ہے اور جنہوں نے تقسیم کے فارمولے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ چونکہ کسی بھی ملک کی نیک نام شہرت اور قابل تحسین نظام حکومت وہاں کی اقلیت کی پر امن اور خوش حال زندگی پر منحصر ہے۔ اس لیے ہندوستان کا ہر شہری اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے ملک کے وقار کو اقوام عالم کی نگاہ میں مجروح ہونے سے بچائے۔ ماضی قریب میں ہم کئی بار سنگین آزمائشوں سے دوچار ہوئے، کئی بار حوصلہ شکن حادثوں سے تصادم ہوا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم پگھلے ہوئے سونے کی طرح نکھرتے گئے۔ ہماری ہمت کے لیے وہ بڑا ہی صبر آزمایا وقت تھا جب ہماری آبادیاں اچانک صحراؤں میں بدل گئیں اور انسانوں کے بجائے درندوں سے ہمیں سابقہ پڑا۔ لیکن ہم پھر اسی ویرانے میں آکر بس گئے اور درندوں کے بھٹوں کے قریب اپنے گھر بنا لیے۔ ہمارے دل کا آئینہ بھی کتنا بے غبار ہے کہ مصائب و آلام کی آندھیوں کا سارا گرد ہی چار روز میں دھل گیا اور وہ وقت تو عرصہ محشر کا تھا جب کشمیر اور پنجاب کی سیماؤں پر گولیوں اور گولوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

اچانک اپنے ہی وطن میں ہم مشتبیہ ہو گئے، اعتماد اٹھنے لگا، بدگمانیاں بڑھنے لگیں اور اب ہماری جگہ باہر نہیں تھی یا تو محاذ جنگ پر تھی یا پھر سلاخوں کے اس پار تھی۔ اس مرتبہ بھی ہم نے نہایت پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ کھراسونا آج نہیں توکل پرکھ ہی لیا جائے گا۔ چند ہی دن کے اندر پرکھ لیا گیا۔

ملک کے خلاف سازشوں کی رپورٹ جب منظر عام پر آئی تو آواز کسنے والوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ وطن پرستی کا سارا غور ٹوٹ گیا۔ الزام لگانے والے خود ہی الزام کی زد میں آ گئے لیکن ملک کے سارے طول و عرض میں مثال کے طور پر بھی ہماری وطن دشمنی کا کوئی چھوٹا سا چھوٹا واقعہ نہیں مل سکا۔ ہمارے متعلق دنیا بس اتنا جان سکی کہ ہم نے ہزار مذہبی اور روحانی تعلقات کے باوجود دشمن کو پسپا کرنے کے لیے سیم وزر اور جان و سر کی

بازی لگا دی۔ لیکن ہماری ان تمام قربانیوں، وفاداریوں اور غم فروشیوں کا ہمیں کیا صلہ ملا؟ چوٹ..... فریاد..... آنسو۔

جمشید پور کی داستان حسرت:۔ مثال کے طور پر صرف جمشید پور کے مسلم مزدوروں نے اکاون ہزار روپے وان کی سلامتی کے لیے فنڈ کی نذر کئے تھے۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کی زونل کشمیر کانفرنس بھی وہیں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت بہار کے وزیر اعلیٰ شری کے بی سہائے اور افتتاح جناب غلام محمد صادق وزیر اعلیٰ کشمیر نے فرمایا تھا۔ مقررین میں مرکزی وزیر شری راج بہادر نئی دہلی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان حضرات کے علاوہ صوبہ جات کے وزراء بھی شریک ہوئے تھے۔ لیکن ایک سال بھی نہیں گزرنے پایا کہ جمشید پور کے گھائل اور مظلوم مسلمانوں کو دوبارہ چوٹ دی گئی۔ اس بار کی چوٹ تلواروں کی نہیں تھی، اس لیے خون نہیں بہا نہ چہرے سرخ ہوئے۔ لیکن دل ٹوٹ کے رہ گئے۔ یہ ٹوٹا ہوا گھراب تک نہیں بن سکا۔ مخمور فرماؤں کی شرارت سے ہمارے گھر تو اجڑ ہی چکے تھے اس بار عقیدت و محبت کی انجمن بھی ویران ہو گئی۔

جمشید پور کے ایک حصے میں محرم کی مذہبی تقریبات پر دفعہ ۴۴ کا نفاذ کر کے مسلمانوں کے جذبات گھائل کر دیے گئے، احتجاجاً ساٹھ ہزار مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہمارے مذہبی حق پر سے پابندی نہیں اٹھائی جائے گی اس سال محرم نہیں منایا جائے گا۔ اپنے فیصلے پر مسلمان لوہے کی فصیل کی طرح کھڑے رہے۔ اندر اور باہر کا کوئی دہلہ بھی انہیں نہیں ملا۔ دسویں محرم کو ادا سیوں اور مایوسیوں میں سارا شہر ڈوبا ہوا تھا۔ یزیدیت مسکرا رہی تھی کہ پھر ہم نے ایک خون کیا۔ سروں کا نہیں حسرتوں کا خون!!

بہار کے وزیر اعلیٰ شری کے بی سہائے آئے، وزیر قانون سید جعفر امام آئے اور مقامی افسروں کو ہدایت کر گئے کہ پابندی اٹھالی جائے اور محرم کی مذہبی تقریب ادا کرنے کی مسلمانوں کو اجازت دیدی جائے۔ امیدوں کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہر طرف وزیر اعلیٰ کی انصاف پسندی اور فراخ دلی کی واہ واہ ہونے لگی۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد یہ راز کھل گیا کہ بہار کے اصل فرماں روا کے بی سہائے نہیں ہیں ان کے وہ لوکل افسر ہیں جو مسلمانوں کے مذہبی

احساسات کا خون کرتے وقت وزیر اعلیٰ کی بھی پروا نہیں کرتے۔
اس سلسلے کی ایک بات نہیں بھولتی، ہمیشہ یاد رہے گی۔ ان دنوں ہم سخت پریشان تھے،
دفتر اور بنگلوں کا چکر کاٹتے کاٹتے برا حال تھا۔ شہر کے ایک ذمہ دار ہندو نے کہا: مولانا!
آپ ناحق پریشان ہیں، اجازت نامے کا انتظار کرنا بزدلوں کا کام ہے۔ بازار کے جس حصے
میں آپ حضرات کے مذہبی حق پر قانون کا پہرہ بٹھا دیا گیا ہے، ہمارے ساتھ ایسا واقعہ پیش
آتا تو ہم وہ بازار ہی جلا کر رکھ کر دیتے۔

وہ شاخ ہی نہ رہے جس پہ آشیانہ ہو
آپ کو یقین نہ آئے تو آنے دیجیے رام نومی کا موسم، ہر سال کی طرح امسال بھی ہمارا
جلوس اسی بازار سے نکلے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں امن پسندوں، شریفوں
اور قانون کا احترام کرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

(پندرہ روزہ جام کوثر، کلکتہ، ۱۵ اگست ۱۹۶۶ء)

دل کی آگ

دل ہی ڈبوائے دل ہی ابھارے
دل سا دوست نہ دل سا دشمن

میری زندگی کا یہ بالکل پہلا اتفاق تھا کہ جام کوثر کی ابتدائی تیاریوں کے لیے مجھے کلکتہ میں لگا تار دو مہینے تک قیام کرنا پڑا یا پھر مسلسل دو ہفتے تک مجھے اس وقت یہاں رکنا پڑا، جب کہ یہ شہر تباہی کے دہانے پر تھا۔ لٹے ہوئے قافلوں کی یاد آج بھی دماغ کے نہاں خانے میں محفوظ ہے۔ کہتے ہیں کہ غفلتوں کی پشت پر وہ قدرت کا ایک تازیانہ تھا جس کی چوٹ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عبرتناک تماشایہ ہے کہ سونا پگھلنے کے بعد نکھر جاتا ہے اور ہم آلام کی سرخ بھٹی سے نکل کر اور غبار آلود ہو گئے۔ دینی امنگوں کا جو موسم ابھی ابھی گزرا ہے اس کی خوشگوار راتیں بہت دنوں تک یاد رہیں گی لیکن انہی ایام کے وہ چند لمحے بھی کبھی نہیں بھول سکوں گا جب کہ دل پر بجلی گری، خرمن جلا اور آج تک اسی آگ میں سلگ رہا ہوں۔

ایک دردناک واقعہ:- بد قسمتی سے ایسا اتفاق دوبار پیش آیا۔ رسول کے نام پر بزم آراستہ کی گئی، میں تقریر کے لیے حاضر ہوا، قرآن وحدیث کے پیغامات سے عشق و ایمان کی روح تازہ ہوئی، صلاۃ وسلام پر جلسہ ختم ہوا، دعا مانگی، رخصت ہوئے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ جلسہ گاہ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے ایک ہجوم پر نظر پڑی، میں نے اپنے میزبان سے دریافت کیا! اب یہ ہجوم کہاں جا رہا ہے، جلسہ تو کب کا ختم ہو گیا؟ انہوں نے دبی زبان سے کہا اسی جگہ اب قوالی ہے عورت کی قوالی!!

لا الہ الا اللہ: جہاں چند لمحے قبل رحمت ونور کی بارش ہوئی تھی اب اسی جگہ قہر الہی اترے گا۔ اس خبر سے دل پر جو قیامت ٹوٹی اس کی کیفیت نہیں بیان کر سکتا۔ غیرت کے ساتھ استعجاب بھی ہوا کہ رسول کے نام پر جو محفل سنواری گئی، اب اسے شیطان کے حوالے کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی لوگوں کو، جنہوں نے آقا کی خوشنودی کا اہتمام کیا تھا، انہی لوگوں نے آقا کی ناراضگی کے بھی اسباب فراہم کر لیے۔ اس طرح رحمتوں کا کھلا دروازہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے مقفل کر لیا۔ محنت بھی رائیگاں گئی، اجر بھی ضائع ہوا اور عذاب کا بارگراں اوپر سے لدا۔ اس تجارت میں سوا خسارہ کے کیا ہاتھ آیا؟ افسوس ہے ان کی عقلوں پر جنہوں نے اپنے ہی حق کا خون کیا۔

وارننگ:- میں نہایت صفائی کے ساتھ بر ملا یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم محفل میلاد کو قلب و روح کی عبادت گاہ سمجھتے ہیں۔ غلاظت ہی پھیلا نے پر لوگ تل گئے ہیں تو اپنے گھروں میں پھیلائیں، ہم کسی بھی قیمت پر اپنی روحانی عبادت گاہوں کی آلودگی برداشت نہیں کر سکتے۔ محفل قدس کے ساتھ عورتوں کی قوالی کا پیوند جوڑ کر ہم مذہب کی بے حرمتی کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

محافل میلاد کو زندہ پائندہ رکھنے کے لیے ہم صدیوں سے اپنے جگر کا خون اس لیے نہیں جلا رہے ہیں کہ وہاں ابلیس کا ننگا ناچ کرایا جائے۔ آپ مسلمان ہیں تو ایک شریف اور خدا ترس نمازی کی طرح مسجدوں کا فرش سجدوں کے لیے استعمال کیجیے۔ عقیدے کی ہم آہنگی سے ہم آپ کو ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ سمجھ میں بات نہیں آتی کہ کس چیز کے نشے میں لوگ اتنے مدہوش ہو گئے ہیں کہ مقام محترم کا امتیاز بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ حرم کی سرزمین سجدوں کے لیے ہے شیطانی رقص کے لیے نہیں ہے۔ زمین کے کسی حصے پر دو رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد وہاں غلاظت ڈالنے کو جی نہیں چاہتا، آخر غیرت ایمانی کہاں مر گئی ہے ان لوگوں کی کہ قرآن وحدیث کی تلاوت گاہ سے ابلیس کا جادو جگاتے ہیں۔

نظر کی آوارگی اور شہوانی گم رہی بجائے خود ایک دردناک عذاب کا پیش خیمہ ہے، لیکن

سب سے بڑی مصیبت تو ”طیبات“ کے ساتھ گستاخی اور مذہبی حرمتوں کی پردہ دری ہے۔ جوش و وحشت میں اگر صحرائے کفر کے درندے قرآن کے اوراق اور مساجد کے میناروں کا جگرشق کرتے ہیں تو یہ ان کی اسلام دشمنی ہے، لیکن اسلام کے ان دوستوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ دین کی جلالتوں سے کھیل رہے ہیں۔

مقام عبرت:- ابھی کی بات ہے کہ کلکتہ کی شاہراہوں پر ہماری عزت و ناموس کی خاک اڑ رہی تھی، نغموں کی جگہ دل کے نالوں اور تبسم کی جگہ گریہ درد نے لے لی تھی۔ اس ہنگامہ محشر میں ہماری زندگی کتنی پاک اور معصوم ہو گئی تھی اور اب ذرا سی دھوپ ڈھلتے ہی ہم پھر اپنے اسی عالم خواب کی طرف پلٹ گئے۔ فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، یہ صرف سکون کا ایک وقفہ ہے، ابھی آلام کے سائے سے ہم باہر نہیں آئے ہیں۔ ہماری بے لگام سرمستیوں کا یہی عالم رہا تو قہار و جبار خداوند کے یہاں تازیانوں کی کمی نہیں ہے۔ کیا قیامتوں، زلزلوں، طوفانوں اور کالی گھٹاؤں میں چپکنے والی بجلیوں کے علاوہ ہماری بیداری کا اب کوئی اور ذریعہ نہیں رہ گیا ہے؟ دریائے ہنگی کی لہروں میں ڈوب کر مرنا چاہئے ان مسلم نوجوانوں کو جن کا دل تلواروں کی جھنکار کے بجائے بازاری عورتوں کے نغموں نے بہلا دیا ہے۔ شباب کی امنگوں کا موسم اس لیے نہیں ہے کہ وہ بدست ہاتھیوں کی طرح ہر طرف بھکتے پھریں۔ اسی موسم جنوں انگیز میں تاریخ کے اوراق پر ایسے نوجوان کبھی ہمیں نظر آتے ہیں جنہوں نے عین کالی گھٹاؤں میں میخانوں کی بنیادیں الٹ دی ہیں اور رات کی تنہائیوں میں نغمہائے طرب سے نہیں تلاوت قرآن کے زمزموں سے اپنے جگر کی آگ بجھائی ہے۔ ارمانوں اور حسرتوں کی لاش اپنے کاندھوں پر لیے پھرنے والی قوم کو بھی اگر یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی راتیں خمار آلود قہرہوں میں بسر ہوں تو نغمہ و رباب کی یہ ”محفل آوارہ“ چلو قبرستانوں میں منعقد کریں، جنازوں کے پیچھے شہنائی بجائیں، ستار کے دھن پر اپنے مردوں کو کفن پہنائیں اور پائل کی جھنکار پر انہیں سپرد خاک کر دیں۔ معاذ اللہ من شرور انفسنا۔ سن لینا چاہئے کہ نفسانی ہیجان کا عفریت جب تک ہمارے اوپر مسلط ہے دل بیمار کا کوئی علاج سود مند نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کو اگر دنیا میں معزز بن کر زندہ رہنا ہے تو خود سری اور نفس پرستی کا

چلن چھوڑنا ہوگا، ہم آزاد نہیں کہ جدھر منہ اٹھائیں چل دیں، ہماری مہار اسلام کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چلائے گا چلنا ہوگا۔ ہماری موت جس کی مرضی کے تابع ہے بیشک زندگی بھی اس کی مرضی کے تابع نہ ہوگی تو دونوں جہاں میں سے کسی جہان کا اعزاز حاصل نہ ہو سکے گا۔ خدا ہمیں نفس کی شرارتوں سے محفوظ رکھے اور راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جام کوثر کا خمار:- سجدہ شکر کی بیتابیوں سے پیشانی بوجھل ہوتی جا رہی ہے کہ جام کوثر کے لیے خدا نے دلوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں ”جام کوثر“ کا جتنا پر تپاک خیر مقدم کیا جا رہا ہے ”ہماری ڈاک“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(پندرہ روزہ جام کوثر، کلکتہ، یکم ستمبر ۱۹۶۶ء)

مجلس مشاورت کی بابت جام کوثر کے قارئین نے مختلف حلقوں سے دریافت کیا ہے کہ وہ الیکشن میں مسلمانوں کی رہنمائی سے متعلق جو تحریک چلا رہی ہے وہ کہاں تک مفید ہے اور کیا ہمیں مجلس سے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار واپس لاسکے گی؟ اس سوال پر معاصر روزنامہ ”آزاد ہند“ کلکتہ نے الیکشن میں مسلمانوں کی رہنمائی کے عنوان سے چار قسطوں میں اداریہ لکھا ہے اور یہ جامع، مفید اور حقائق پر مبنی ہونے کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے عام تر کیا جائے۔ اس لیے الگ سے اپنے قارئین کو جواب دینے کے بجائے اس کی چوتھی قسط ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ مدیر

”اب آئیے ایک اور پہلو سے بھی مسلم مجلس مشاورت پر نظر ڈالتے چلیں۔ مسلم مجلس نے ”جو عوامی منشور“ جاری کیا ہے وہ اس دعوے اور ولولے کے ساتھ ہے کہ مجلس مشاورت مسلمانوں کے مندرجہ بالا احساسات گزشتہ ۱۹ سالہ تجربات اور ملک کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب سمجھتی ہے کہ آنے والے انتخابات کے سلسلہ میں وہ ملک کو اور خاص کر مسلمانوں کی رہنمائی کرے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ سب سے پہلے یہ طے کرنا ہے کہ مجلس مشاورت کو یہ پوزیشن حاصل بھی ہے یا نہیں کہ وہ الیکشن میں مسلمانوں کو رہنمائی دے سکے اور ان کی طرف سے کسی سیاسی پارٹی سے انتخابی سمجھوتہ کر کے مسلم ووٹروں کی قیمت پر سودا طے کر سکے، اسی سوال کا جواب ہمیں خود مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند کے ایک دوسرے مضمون میں مل جاتا ہے جو آپ نے ”دعوت“ (دہلی) کی اشاعت مورخہ ۲۸/ اگست ۶۶ء میں ”مسلمانوں میں بیداری کی نئی کروٹ“ کے عنوان

سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں مولانا نے اپنے پہلے والے مضمون بعنوان ”مسلمانوں کا اتحاد و تنظیم اور الیکشن“ (اشاعت ’دعوت‘ مورخہ ۲۵/ اگست ۶۶ء) کے برعکس مسلم مجلس مشاورت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اصل سوال درحقیقت اس کا ہے کہ بحالات موجودہ وہ (مسلمان) الیکشن سے فائدہ کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا یہ خیال پہلے ہی پیش کر چکے ہیں کہ ہندوستان اور خود مسلمانوں کے اپنے حالات کے پیش نظر کم از کم فی الحال اس کا کوئی موقع نہیں ہے کہ ان کی کوئی الگ سیاسی پارٹی قائم ہو جو الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرے۔ جداگانہ طریقہ انتخاب کے بجائے مخلوط طریق انتخاب کا رائج ہونا بجائے خود ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اس پر مستزاد یہ بات کہ وہ (مسلمان) بجائے خود منظم نہیں ہیں۔“

یعنی مولانا چاہتے تو ہیں مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی تنظیم اور جداگانہ انتخاب بھی لیکن فی الحال نیم سیاسی جداگانہ تنظیم کی حیثیت سے رکھنے پر قانع ہیں جو (ممکن ہے) خود تو براہ راست الیکشن میں حصہ لیتے ہوئے اپنے امیدوار کھڑے نہ کرے لیکن الیکشن لڑنے میں دوسری پارٹیوں کو مدد دے، کسی کی مخالفت کرے اور کسی کی موافقت اور جس پارٹی سے سودا ہو جائے اسے مسلمانوں کے ووٹ دینے کی طرف رہنمائی کرے:

مگر اسی مضمون میں آگے چل کر مولانا کے فکر و رائے کا تضاد اور نمایاں ہو جاتا ہے آپ فرماتے ہیں: ”بہت سے لوگوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ مسلم مجلس مشاورت سیاست میں کوئی سرگرم حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس سلسلے میں جو عملی مشکلات اور دشواریاں ہیں ان کو وہ اپنے طور پر کسی نہ کسی طرح حل کر چکی ہے اور اسی کے مطابق وہ الیکشن میں مسلمانوں کو رہنمائی دینا چاہتی ہے، خاص طور سے اس بارے میں کہ وہ آئندہ الیکشن میں کسی پارٹی کا ساتھ دیں۔ مسلم مجلس مشاورت کے ساتھ مسلمانوں کے حسن ظن کا تو میں دل سے خیر مقدم کروں گا۔ لیکن میرے اپنے خیال کے مطابق اس کے بارے میں کوئی ایسی رائے قائم کر لینا جو واقعہ کے خلاف ہو، نہ مجلس کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور نہ رائے قائم کرنے والوں کے لیے۔ اس لیے میں نے مجلس یا اس کے موجودہ یا آئندہ فیصلہ کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے اسے یہاں صاف صاف

عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اس خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں کہ مجلس مسلمانوں کا ایک واقعی مستحکم وفاق بنے جو خود الیکشن کے تعلق سے مسلمانوں کی پوری رہنمائی کر سکے کہ انہیں ملک و ملت کے مفاد کے لیے کیا کرنا ہے، لیکن اس بارے میں کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ ابھی اس طرح کا کوئی وفاق وجود میں نہیں آسکا ہے اور مجلس مشاورت کے نام سے جو تنظیم وجود میں آئی ہے وہ مسلمانوں کی بہترین خواہشات اور تمناؤں کے باوجود ابھی اپنے استحکام کی نہایت ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں میرے اپنے اندازے کے مطابق وہ اگر چاہے بھی تو الیکشن کے بارے میں وہ خود دور تک جانے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اور نہ اس بارے میں مسلمانوں ہی کو کوئی بڑا مشورہ دے سکتی ہے۔ پھر میرا اپنا احساس یہ بھی ہے کہ مجلس نے جن مقاصد کو اہمیت دی ہے خود ان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ وہ حتی الوسع الیکشن کی عملی سرگرمیوں میں اپنے کونہ ڈالے۔“

چلیے چھٹی ہوئی۔ اللہ اللہ خیر سلا! کہاں تو یہ دم خم کہ مجلس پورے ”ملک کو اور خاص کر مسلمانوں کو رہنمائی“ دینے کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ اٹھی تھی اور ملک کے مختلف حصوں میں اس نے ہفتہ منشور بھی منا ڈالا، جلسے جلوس بھی ہو گئے۔ اور کہاں مجلس کے ایک اہم رکن اور بانی جو تین دن قبل اپنے مضمون میں مسلمانوں کے اتحاد اور تنظیم کا خیر مقدم کر چکے تھے، مزید غور و فکر کے بعد جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مجلس مشاورت ابھی بچہ ہے اور اپنے استحکام کی نہایت ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔“ اور یہ کہ مجلس کو یہ پوزیشن حاصل نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو رہنمائی دے سکے اور نہ مجلس کو الیکشن کے جھیلوں میں پڑنا چاہئے وغیرہ۔ عجیب بات ہے کہ جب دلی میں گزشتہ جولائی میں مجلس مشاورت کی ورکنگ کمیٹی کی سہ روزہ بیٹھک ہوئی اور جس میں مولانا ابواللیث خود بنفس نفیس موجود تھے، وہاں تو یہ فیصلہ بڑی آسانی سے ہو گیا کہ مجلس الیکشن کے اکھاڑے میں کودے گی اور مسلمانوں کو رہنمائی دے گی اور اسی مقصد کے لیے ”عوامی منشور“ جاری کیا گیا، پھر ہفتہ منشور منایا گیا، تو اس وقت مولانا نے مجلس کے سامنے اپنا نقطہ نظر کیا پیش نہیں کیا تھا؟ یا اس وقت ان کی رائے کچھ اور تھی؟ یعنی اس وقت تک محض یہ ایک خیال اور ولولہ تھا اور جب وہ منظر عام پر آیا،

اخبارات میں اس پر بحثیں ہوئیں، مجلس نے ہفتہ منشور منایا جس میں مسلمانوں کی زیادہ یا کم تعداد میں شرکت سے ان کی دلچسپی، اور ہمت افزائی کے رجحان کا پتہ چلا تو اب مولانا ابواللیث نے مجلس کی اہمیت گھٹانے اور اس کی رہنمائی کی صلاحیت کا بھانڈا پھوڑنے کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔“

(پندرہ روزہ جام کوثر، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء)

حق کی راہ کا کاٹنا

دین کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کا غلط تخیل اور غلط عمل ہے۔ انسان اگر کسی غلط نظریہ حیات کو اختیار کر لے تو وہ صحیح رخ سے پھر جاتا ہے اور غلط روح میں کام کرنے لگتا ہے اور جب صحیح فکر کو اپناتا ہے تو اس کی زندگی کا سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔ کسی فکر کی خوبی یا خامی کو خالص علمی یا عقلی بنیاد پر معلوم کرنا یقیناً دشوار ہے لیکن اس کے نتائج کو دیکھ کر اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنا نسبتاً آسان۔ جس شخص کو فکر غلط کے نتائج بے چین کر دیں اس پر دین کی حقیقت آسانی سے کھل جاتی ہے، لیکن جو شخص اس کے نتائج سے مطمئن رہتا ہے، دین کی طرف اس کا متوجہ ہونا بہت مشکل ہے۔ دنیا کے بیشتر انسان اسی وجہ سے خدا کے دین کو چھوڑے ہوئے ہیں کہ انہیں اس کا قطعاً احساس نہیں ہے کہ غلط افکار و نظریات نے ان کی زندگی کو کس قدر فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے۔ فکر صحیح کے فقدان سے ان کے اخلاق تباہ ہو گئے ہیں، ان کی معاشرت بگڑ گئی ہے۔ ان کی معیشت و سیاست میں خلل آ گیا ہے۔ اس کے باوجود ان میں اپنی اصلاح کے لیے کوئی بے چینی اور اضطراب نہیں ہے۔

آج سے چند صدی پہلے جب کہ دنیا کا نظام صالح اور خدا ترس فرماں رواؤں کے ہاتھوں میں تھا، اس وقت کتنی فارغ البالی اور کتنی برکت و آسائش تھی۔ ہماری زندگی میں اور آج دنیا کے الحاد پرست، باطل اندیش اور ناخدا ترس حکمرانوں نے کتنا پراگندہ حال اور آشفٹہ بنا دیا ہے انسانوں کو۔ حالانکہ پچھلے زمانوں کے مقابلے میں آج راحت و آسائش کے وسائل و ذرائع کی اتنی فراوانی ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس لیے جب تک

نگہ انتخاب کا زاویہ نہیں بدلے گا اور جب تک دنیا مفاد حاضر کے مقابلے میں مفاد آخرت کو ترجیح نہیں دے گی، روح کی گمشدہ مسرتوں کی واپسی ناممکن ہے۔

سیلاب، غذائی بحران، قحط سالی اور ہماری بے امان زندگی کے سارے مصائب، اسی فکر غلط اندیش کے نتائج ہیں جو اس کائنات پر کائنات کے خالق کا حق تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ حالات پر اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ کارخانہ ہستی، بنانے والے کی مرضی کے خلاف چلایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب مشین غلط رخ پر استعمال کی جائے گی تو ٹوٹ پھوٹ اور فساد کا واقعہ ہونا ضروری ہے۔

آج کھیتی اگانے سے لے کر بچوں کی پیدائش تک ہر جگہ انسان اپنے آپ کو خود مختار تسلیم کرتا ہے حالانکہ قرآن نے بار بار تنبیہ کیا ہے کہ تمہارا کام صرف زمین کا سیدہ شق کر کے دانہ ڈال دینا ہے۔ باقی رہ گیا دانہ اگانا اور فصل کھڑی کرنا، یہ سب ہماری قدرت کا عمل ہے۔ کسی بھی نظام باطل کا خراب اثر جہاں قوموں اور ملکوں پر پڑتا ہے، وہاں افراد بھی اس کے نتائج بد سے محفوظ نہیں رہتے۔ آج زندگی کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی جتنی کوشش ہو رہی ہے اتنے ہی نئی گرہوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیڈروں کی غلط رہبری میں اب دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے، اب بھی واپسی کا موقع ہے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، اکتوبر ۱۹۶۶ء)

خراج عقیدت

تاجدار مسند ولایت، امیر کشور ہند سرکار خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار کا جاہ و جلال، ان کے اقتدار کا شاہانہ کردار، ان کے چمن کا موسم، ان کے میکدہ کا سرور کیف، ان کے آستانے کا جشن عقیدت اور سیلاب کی طرح امنڈتے ہوئے ان کے وارفتہ حال دیوانوں کا ہجوم، یہ سارا عالم شوق بارگاہ رسالت کے فیضان کا صدقہ ہے اور قیامت تک یہ صدقہ جاری رہے گا۔

دیار ہند میں حضرت خواجہ کا وجود سرکار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شوکت اقتدار کا ایک زندہ و تابندہ معجزہ ہے۔ آستانہ پاک کا سارا ہنگامہ عقیدت، قرآن کے وعدہ فردا، مومن کے اخروی اعزاز، اسلام کے روحانی اقتدار اور ایک بندہ مقرب کے فیروز بخت انجام کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

عشق و اخلاص، طہارت و تقویٰ اور حسن عمل پر آسمانی خلعتوں اور حقیقی جزاؤں کا سلسلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہ حسب وعدہ الہی بعد وفات کی منزل ہے، لیکن عقل غلط اندیش کی ذرا فتنہ گری ملاحظہ فرمائیے کہ دنیوی زندگی کی ساری آرائشوں، توقیروں اور مصنوعی عظمتوں کو وہ جینے والوں کی جدوجہد کا واجبی حق سمجھتی ہے، لیکن جہاں کسی بندہ مقرب نے دنیا سے رخت سفر باندھا اور اس عالم میں پہنچ گیا جہاں وہ اپنے اعمال صالحہ کے بل پر ابدی سرفرازیوں، دائمی عزتوں اور ظاہری و باطنی فیروز مندویوں کا بجا طور پر مستحق ہے، وہیں یہ ظالم اس کے اعزاز و توقیر کے استحقاق سے انکار کرنے لگتی ہے۔ خود شرسا نہیں ہوتی، منشاء الہی کی تعمیل کرنے والوں پر زبان طعن دراز کرتی ہے۔

اسلام اپنے نیاز مندوں کو ترغیب دیتا ہے کہ دنیا تمہارے لیے زنداں ہے، یہ دل اٹکانے کی جگہ نہیں ہے۔ اپنی خواہشات کو دبا کر، ارمانوں کا خون کر کے، دل کی حسرتوں کو پامال کر کے، یہاں پابند اور بے سرو سامان اسیروں کی طرح زندگی گزارو، دنیا کی یہ ساری نمائشیں، ساری برائیاں، سارا کردار، سارا جاہ و حشم سراب ہے، فریب نظر ہے، منہ پھیر کر ان سے گزر جاؤ، تمہاری منزل عیش آگے ہے بہت آگے، جہاں اس مادی عالم کی سرحد ختم ہوتی ہے۔

اسلام کی ہدایت کے مطابق ایک صالح مسلمان دنیا میں مسکین، بے سرو سامان اور سارے ہنگامہ عالم سے بے توجہ ہو کر زندگی گزارتا ہے، اگر وفات کے بعد بھی اسے عزت و اقتدار اور وقار و سکون کی نعمت حاصل نہ ہو تو اس بھری دنیا میں اس سے زیادہ رائیگاں وجود اور کیا ہو سکتا ہے؟ پھر وہ مذہب کہ جس کے پاس نہ دنیا ہو نہ آخرت اسے کون قبول کرے گا؟ جو لوگ اس طرح کے خیالات میں مبتلا ہیں وہ دوست کے روپ میں اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔

الحاد اور مادہ پرستی کے اس دور میں جب کہ روحانی قدروں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ روحانی توانائیوں پر یقین رکھنے والے منظم ہو کر حضرت خواجہ کے روحانی انقلاب کی تاریخ سے نئے ذہنوں کو قریب کریں۔ اعتقادی سطح پر اہل سنت کی حریف جماعتوں نے ولایت و روحانیت کی توانائیوں کے خلاف، دماغوں میں جواز ہریلے جراثیم پھیلا دیے ہیں، ان کا ازالہ کرنا اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اسلام کا یہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

بڑا قلق ہوتا ہے اس صورت حال سے کہ عقیدت مند ان اولیا کا بہت بڑا طبقہ مراسم عرس اور درگاہی روایات میں والہانہ سرگرمیوں کے ساتھ حصہ لیتا ہے، لیکن حریفان اولیا کی جارحانہ پیش قدمیوں کے سوال پر سارا جوش عقیدت سرد پڑ جاتا ہے، ذاتی مفاد کی مصلحتیں فرض کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں، آنکھوں کے سامنے اولیائے حق کی حرمتوں کا قتل عام کیا جاتا ہے، لیکن دفاع کے لیے زبان تک نہیں کھلتی۔

صلح پسندی کی جھوٹی شہرت کے لیے یہ طبقہ اپنے مذہبی حریفوں کو بھی برسرِ حق سمجھتا ہے بلکہ ان کے دینی وقار اور منصبی احترام کا خطبہ پڑھ کر بالواسطہ ان کے اعتقادی موقف کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور نہیں تو علمائے حق کا جو گروہ صوفیہ کرام اور سلف صالحین کی روحانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے شب و روز سینہ سپر رہتا ہے، اس کا شکر گزار اور دعا گو ہونے کے بجائے یہ طبقہ اس کے خلاف برملا اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے قطعاً کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔

ان حالات میں ہمیں اپنی بکھری ہوئی صلاحیتوں اور پراگندہ قوتوں کو ایک مرکز پر سمیٹنا ہوگا، تاکہ داخلی اور خارجی حملہ آوروں کا پوری دل جمعی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ پندرہ روزہ جام کوثر کلکتہ مذہبی توانائیوں کی جن امنگوں کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے اگر اسے زندگی کی فراغتیں حاصل ہوئیں تو وہ اہل سنت کی صفوں کو بکھری ہوئی حالت میں نہیں رہنے دے گا، امنڈتے ہوئے فتنوں کے زمانے میں ہمارا جماعتی انتشار بجائے خود ایک بہت بڑے خطرے کی علامت ہے۔

ادارہ ”جام کوثر“ بارگاہِ خواجہ میں ”غریب نواز نمبر“ کا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بس ایک ”نگاہ کار ساز“ کا متمنی ہے، جن ٹھوکروں نے پادشاہوں کو جنم دیا ہے، جن نگاہوں نے ایک لمحے میں کفر کے چڑھے ہوئے سمندروں کا طوفان اتارا ہے، بندہ نوازی کی جن اداؤں نے راہ کے پامال ذروں کو آسمان کی رفعتوں کا وقار بخشا ہے، کچھ عجب نہیں ہے کہ چشمہ کرم کی ایک موج حیات ”جام کوثر“ کو صحیح معنوں میں جام کوثر بنادے۔

خود آپ سمجھتے ہیں مرے دل کی کہانی

کیا فائدہ دہراؤں اگر شوق کے دفتر

(پندرہ روزہ جام کوثر، کلکتہ، اکتوبر ۱۹۶۶ء)

جام کوثر جدید

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

ذہنی سکون سلامت رہے تو دنیا میں بڑا سے بڑا کام ہو سکتا ہے، جس ناسازگار ماحول اور بے سرو سامانی کے عالم میں ”پندرہ روزہ جام کوثر“ کا میں نے اجرا کیا تھا وہ مسلمان کلکتہ سے مخفی نہیں ہے، کتنی راتوں کی نیند قربان ہوئی، کتنے دنوں کا چین نذر تمنا ہوا، وقت کی کتنی عظیم ضرورتیں نثار ہوئیں اور خون جگر کے کتنے قطرے حسرتوں کی خاکستر میں جذب ہوئے تب کہیں جا کر کوثر کے چند جام ہمارے جلتے ہوئے لبوں تک پہنچے۔

رپن لین کے بجائے زکریا اسٹریٹ کو اپنی صحافتی سرگرمیوں کا مرکز منتخب کر کے جس خوش فہمی کا میں شکار ہوا تھا افسوس کہ وہی میری راہ میں حائل ہوئی۔ شہر کے ایک مرکزی اور مشہور مقام پر دفتر کے قیام سے جو وسیع اور بلند مقاصد میرے پیش نظر رہے، میری بد قسمتی کہیے کہ ساتھیوں کا ذہن ان سے ہم آہنگ نہ ہو سکا، آزر دگی کی تلخیاں پیدا ہوئیں، بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ کئی مہینے ذہنی حادثوں سے دوچار رہنے کے بعد بالآخر جام کوثر میں نے ان کے حوالہ کر دیا۔ مجلس انتظامیہ میں کسی طرح کی تبدیلی کے بجائے خود الگ ہو جانا مجھے زیادہ آسان نظر آیا۔ اس لیے یہ اعلان کرتے ہوئے اطمینان محسوس کرتا ہوں کہ پندرہ روزہ جام کوثر کلکتہ کی ادارت سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

میرے ذہن کو بوجھل رکھنے کے لیے مذہبی، تعلیمی اور جماعتی امور سے متعلق میری ملک گیر مصروفیات ہی کیا کم تھیں کہ ذہن کا ایک نیا بوجھ میں پال کر رکھتا اور نہ میرے پاس اتنا

فاضل وقت تھا کہ شکوہ سنجیوں کے بتا دے اور چیرہ دستوں سے پیکار کے لیے صرف کرتا۔
الحمد للہ! کہ جام کوثر کے ساتھ میرا تعلق صرف صحافتی تھا اور وہ بھی خالصاً لوجہ اللہ، شعبۂ
حساب و کتاب حکیم تو حید خاں صاحب ۳۳ زکریا اسٹریٹ سے متعلق تھا۔ انہوں نے مفصل
حساب اور سامان وغیرہ لوگوں کے حوالہ کر دیا ہے۔

بہر حال میری دلی خواہش ہے کہ جام کوثر نکلتا رہے اور اسے فروغ حاصل ہو، وہ میرے
جذبہٴ ایثار و اخلاص کی ایک محبوب یادگار ہے۔

آخر میں میں اپنے تمام احباب اور معاونین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھ پر اعتماد کیا
اور جام کوثر کو ملک گیر بنانے میں میرے حوصلوں کو توانائی بخشی۔

واضح رہے کہ میں نے صرف کارواں بدلا ہے سلسلہٴ سفر منقطع نہیں کیا ہے۔ اب میں
اللہ کا نام لے کر کھلی فضا میں اپنے دوسرے سفر کا آغاز کر رہا ہوں۔ سلطان الہند سیدی غریب
نواز رضی اللہ عنہ کے آستانہ فیض پر جن عزائم کی میں نے تجدید کی ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ
سلامت رہیں گے اور اس طرح کے ذہنی حادثوں سے اب میں دوچار نہیں ہوں گا۔

جام کوثر کے کئی شماروں میں ”معراج نمبر“ نکالنے کا میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے اپنے
دوسرے سفر کے نقطہٴ آغاز پر پورا کر رہا ہوں۔ بے سرو سامانی کے عالم میں جو کچھ بھی ہے
ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدائے شکست سمجھ کر اسے قبول فرمالیجیے۔

طیبہ و بغداد کی رمتوں نے سہارا دیا تو دسمبر میں ”جام کوثر جدید“ یا ”جام نور“ کے نام سے ایک
باوقار، بلند پایہ اور ضخیم و دلکش ماہنامہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ماہنامہ اس لیے کہ ملک کے طول و
عرض میں اپنی مذہبی، جماعتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے لیے میں تھوڑا سا وقت نکال سکوں۔

میرے جن بزرگوں اور دوستوں نے معراج نمبر کے لیے اپنے رشحات قلم بھیجے ہیں
نہایت ادب کے ساتھ ان سے معذرت خواہ ہوں کہ آئندہ شمارے تک وہ انتظار فرمائیں۔

بجلی گرے تو غم نہ کیجیے

سو بار بنے گا آشیانہ

(جام کوثر جدید، کلکتہ، نومبر ۱۹۶۶ء)

کیا ہم جشن عید منانے کے قابل ہیں؟

یہ ماننا کہ عید کا دن مسرت و شادمانی کا سب سے بڑا دن ہے۔ یوں بھی دنیا میں عیش کی
گھڑیاں کم میسر آتی ہیں پھر سال بھر کے اس تنہا جشن کو کیوں نہ عزیز رکھا جائے؟
لیکن یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ ایک غم گین دل کے لیے عیش کی گھڑیوں سے
بڑھ کر اور کوئی وقت غم کی یاد کا نہیں ہوتا۔ ایک غم نصیب ماں جو سال بھر کے اندر اپنے کئی
فرزندوں کو کھوپچلی ہوا اگر عید کے دن اس کو اپنی بقیہ اولاد کے چہرے دیکھ کر خوشی ہوگی تو ایک
ایک کر کے اس کے گم گشتہ لخت جگر بھی سامنے آجائیں گے۔

ایک بد بخت جو اپنا تمام مال و متاع غفلت و بیہوشی میں ضائع کر چکا ہو عید کے دن
لوگوں کی زریں قبائیں دیکھ کر ناممکن ہے کہ اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت کے ساز و سامان یاد
نہ آجائیں۔ پس کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ایک دن کی مسرتوں میں بے خود ہو کر ہمیشہ کے
ماتم و اندوہ کو بھول جائیں۔ بزم جشن کی تیاریاں کس کے لیے جب کہ دنیا اب ہمارے لیے
ماتم کدہ بن گئی ہے، عیش و نشاط کی محفلوں کو آگ لگایے۔ عید کے قیمتی کپڑوں کو چاک چاک
کر ڈالیے، عطر کی شیشیوں کو اپنے بخت زبوں حال کی طرح الٹ دیجیے۔ زریں کلاہوں،
اور ریشمی قبائوں کے پہننے کے دن اب گئے۔ اب تو اپنے سو گوار چہروں پر خاک اڑانے کے
دن ہیں، کیونکہ اس طلسم ذرہ ہستی میں انسان سے باہر غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا، البتہ
ہمارے پاس دوا نکھیں ضرور ایسی ہیں جو اگر غم گین ہو جائیں تو کائنات کی ہر چیز غم آلود ہے
اور اگر مسرور ہو جائیں تو زندگی کا ہر لمحہ نشاط آگین ہے۔

پہلے غم کی تصویر بھی شادمانی کا مرقع نظر آتی تھی اب خوشی کے شادیاں بھی بجتے ہیں تو

ان سے درد و اندوہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اسی ملک میں ہم نے ایک ہزار برس تک عیش و مسرت کے دن کاٹے ہیں۔ جب ہم عشرت و اقبال کی بزم آرائیوں میں تھے تو اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اور اب حسرت و آرزو کے غم کدے میں ہیں تو اس میں بھی ایک شان یکتائی رکھتے ہیں۔ زمانے نے ہمارے مٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس فیصلے کے نفاذ میں دیر نہ کرے۔ گو ہم مٹ جائیں گے لیکن ہمارے لائے ہوئے نقشوں کا مٹانا آسان نہ ہوگا۔ لیکن آج بھی عقلموں کی راکھ کے نیچے ایمان کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، عید کی مچلتی ہوئی خوشی میں کسی دامن کی ہوا بھی میسر آگئی تو اسلام کی حرارت کے جاگ اٹھنے میں دیر نہیں ہے۔ کیا ہماری غیرت حق کی انگڑائی کے لیے یہ صورت حال کافی نہیں ہے کہ بجلیوں نے ہمارے آشیانوں کی خاکسٹر اڑانے کے بعد اب ہمارے دین و ملت کی شاداب ٹہنیوں کو تکا کا ہے۔ عین اس وقت جب کہ اقوام باطل کے سارے افراد اپنے بے نام و نشان مدفن کی خاک سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ہم پر موت کی نیند طاری ہے۔

مسلم پرسنل لا:۔ وہ مذہب اسلام جس کی صداقت دنیا کی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جس کے قانون کو ہم نے الہامی قانون تصور کر کے چودہ سو برس سے اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے، آج چند انسان اس بات پر تل گئے ہیں کہ اس کا رشتہ ہماری زندگی سے منقطع کر دیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارے مذہب کے نجی قانون کو دوسروں پر بھی جبراً مسلط کیا جائے، ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنی دینی تہذیب کے ساتھ اس ملک میں زندہ رہنے کا حق دیا جائے، جب کہ دستور ہند میں ہر فرقے کی مذہبی آزادی کا تحفظ بنیادی حق کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ہمارا یہ حق بجانب، معقول اور بے ضرر مطالبہ بھی ہماری حکومت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ گاؤ کشی کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں بالفاظ دیگر ان کا قطعی یہ مطالبہ ہے کہ ان کے مذہب کا وہ قانون جو انہی کے ساتھ مخصوص ہے اسے جبراً دوسروں پر بھی مسلط کر دیا جائے اور حیرت ہے کہ اس لا دینی اسٹیٹ میں ان کا یہ خالص مذہبی اور فرقہ وارانہ مطالبہ کئی صوبوں میں قانون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور آثار شاہد ہیں کہ جلد یا بدیر سارے ملک پر قانون کو جبری طاقت

کے ذریعہ مسلط کر دیا جائے گا۔

اس کھلی ہوئی بے انصافی اور امتیازی سلوک کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں کا قانون عقل و انصاف کا پابند نہیں بلکہ طاقتور اکثریت کے رجحانات کا پابند ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین واقعہ ہے کہ یہاں سرے سے قانون کی حکومت ہی نہیں ہے، یہاں صرف اس تشدد پسند گروہ کی حکومت ہے جو اکثریت میں ہو یا اپنی بات منوانے کے لیے ملک کا امن و امان غارت کر سکتا ہو۔ یہ ماننا کہ مسلمان آبادیوں کو ویران بنانے نہیں آیا ہے، امن و امان غارت کر کے بد امنی پھیلانا اس کا شیوہ نہیں ہے لیکن حق کی برتری اور پرچم اسلام کی حفاظت کے لیے اس نے قربانیوں کی ایک نئی تاریخ جو مرتب کی ہے اس کے ابھرے نقوش کو کون مٹا سکتا ہے؟ وہ زمانہ ختم ہو گیا جب مظلوم کی خاموشی ایک صدائے قیامت خیز تھی اور تھمے ہوئے سمندر کی سطح پر طوفانوں کے صحرانظر آتے تھے۔ اب تو لہروں کا شور ہی زندگی کی علامت اور طاقت کا نشان ہے۔

(پندرہ روزہ جام کوثر جدید، کلکتہ، جنوری ۱۹۶۷ء)

انتہائی ادب و احترام کے ساتھ خون جگر کا یہ نقش اول تاجدار اہل سنت مفتی اعظم ہند کی بارگاہ میں نذر کرتا ہوں جن کے فیض قدم سے کلکتہ اس وقت لالہ زار بنا ہوا ہے۔

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا

سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

شکر ہے اس خدائے قدیر کا جس کی رحمت کارساز نے آرزوؤں کا ٹوٹا ہوا آگینہ پھر جوڑ دیا۔ پھر خوابیدہ امنگیں جاگ اٹھیں نا کامیوں کی خاکستر سے دکھتا ہوا لالہ پھوٹا اور کئی مہینے کی گمشدگی کے بعد ہمتوں کا پچھڑا ہوا کارواں اپنی منزل کی اصل رہ گزر پر پلٹ آیا۔ ویسے آدمی مایوس نہ ہو تو غیبی چارہ گری اور مخفی دستگیری کا یقین ماتھے کی آنکھ سے ہوسکتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنگلوں میں قصداً آگ لگا دی جاتی ہے اور ہرے بھرے چمن کو دیدہ و دانستہ راکھ کی ڈھیر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ خدا کے پاسبانوں کو سبزہ زاروں سے دشمنی ہے اور انہیں اجڑا ہوا ویرانہ پسند ہے بلکہ اس لیے کہ فطرت کی کتاب دستور میں موسم بہار کے لیے فصل خزاں ضروری ہے، پہلے رات کی سیاہی پھیلتی ہے تب جا کر سحر کا اجالا نظر آتا ہے۔

شاخ گل سے جب تک خون نہیں ٹپکتا پھولوں کی قطار نہیں کھڑی ہوتی۔ جب تک زمین کا سینہ تپ نہیں جاتا کالی گھاٹوں کا موسم نہیں رکتا۔ درختوں کی جڑوں میں سلگنے والی آگ ہی نئی کونپلوں کے لیے دودھ کی غذا اور نمو کی قوت فراہم کرتی ہے۔ شمع جب تک ساکن و خاموش رہتی ہے، تنہا رہتی ہے، جہاں سلگ جاتی ہے ہزاروں چاہنے والے اسے اپنے جھرمٹ میں لے لیتے ہیں۔ فطرت الہی کا بالکل یہی دستور انسانوں کی دنیا میں بھی جاری

ہے۔ یہاں بھی ہر غم کے پیچھے خوشی کا قافلہ چلتا ہے اور ہر ناکامی اپنے پہلو میں کامیابی کی شمع فروزاں لیے کھڑی رہتی ہے۔ جب تک کوئی ”کر بلا“ نہیں قائم ہوتا گلشن اسلام کی بہاروں کو عمر دوام نہیں ملتا اور جب تک انگاروں پر نہیں تڑپایا جاتا، شان بلائی پگھلے ہوئے سونے کی طرح نہیں نکھرتی۔

یہاں سکون کے لیے تڑپنا ضروری ہے اور آرزوئے وصال سے پہلے شب فراق کی قیامتوں کا خیر مقدم لازمی ہے۔ ہر کوشش کے بعد ایک انجام، ہر قدم پر ایک نتیجہ، ہر حرکت میں ایک سکون، ہر آزمائش کے بعد ایک فیروز مند گھڑی نوشتہ کتاب فطرت ہے۔ لیکن سارا ماتم صرف اس محرومی کا ہے کہ راہ طلب میں قدم اٹھانے والے خود ہی تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ معرکہ حیات ہے، یہاں زندگی کی ساری فیروز بختی اسی کے لیے ہے جو اپنی نبض کی آخری دھڑکن تک مشکلات سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور غبار راہ کی طرح پامال ہو جانے کے بعد اپنی ہمتوں کی شکست تسلیم نہیں کرتا، مایوس ہو کر بیٹھ رہنے والوں کے لیے مدفن کے سوا یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ تسلیم کہ آج کے آشفتہ حال مسلمانوں کے پاس گزرے ہوئے عہد اقتدار کی کوئی نشانی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن اسلام کے عروج و اقبال کی جو ایک روشن اور ضخیم تاریخ ہمارے پاس ہے وہی غیبی کارساز یوں کے یقین اور روحانی امتگوں کی توانائی کے لیے کیا کم ہے؟ پھر نہ آسمان کے فرشتوں کی تعداد کم ہوئی، نہ خدا کی قدرتوں کے تیور میں کوئی فرق آیا۔ زوال و عروج اور فتح و شکست کے متعلق محکمہ قضا و قدر کے ازلی قانون میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ ہی کملی اوڑھنے والے محبوب کے اعزاز میں کہیں سے کوئی بل آیا۔ پھر اسی محبوب کی امت جو کل تک افلاک کے برجوں میں رہتی تھی وہ آج اچانک ذلتوں کی خاک پر کیوں تڑپ رہی ہے؟ اس کا جواب سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ نظام رحمت و ربوبیت کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہے، ہم ہی اپنی جگہ پر نہیں ہیں۔ خدا ہماری حالت بدل دے۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے شاہراہوں پر اندھیرا تھا لیکن دل کی انجمن روشن تھی، آج شاہراہوں پر نور برس رہا ہے تو دل کا محل تاریک ہے، ان حالات میں اب اس ضرورت سے

کون انکار کر سکتا ہے کہ تاریکی میں بھٹکنے والی تشنہ لب روحوں کو آج ”جام نور“ کی حاجت نہیں ہے؟ پیاس تو کسی بھی بہتی ہوئی نہر سے بجھ جاتی ہے لیکن جب تشنگی کے ساتھ وحشت ناک تاریکی بھی ہو تو تشنہ کاموں کا رخ سوائے چشمہ نور کے اور کدھر ہوگا؟ اہل نظر کا مشاہدہ ہے کہ مدینے میں نور کا جو ساگر لہراتا ہے وہاں سے بیشمار نہریں پھوٹی ہیں، پینے اور پلانے والے انہی نہروں سے جام بھر بھر کر پیتے اور پلاتے ہیں، ایک جام بھی مل گیا تو باطن کی روشنی اور روح کی آسودگی کے لیے کافی ہے، امام اہل سنت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے اپنے اس شعر میں اسی جام کی تمنا کا اظہار فرمایا ہے۔

میں گدا تو بادشہ بھر دے پیالہ نور کا

نور دن دونا تر، دے ڈال صدقہ نور کا

ماہنامہ ”جام نور“ کے پس منظر میں یہی عقیدہ کارفرما ہے، خدا کرے کہ نام کی برکتیں بھی شریک قلم رہیں۔ اب اخیر میں ”جام نور“ کے مستقبل پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، ماضی میں پیش آنے والی دشواریوں کی لاعلمی کے باعث ذہن کا سارا نقشہ درہم برہم ہو گیا، لیکن اب میں طیبہ و بغداد کی رحمتوں کے بھروسے ہندوپاک میں پھیلے ہوئے اپنے تمام ہمدردوں کو یقین دلاتا ہوں کہ زندگی کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے ”جام نور“ کا تسلسل باقی رکھا جائے گا، ”جام نور“ کا دفتری نظام بھی انشاء اللہ اتنا سنوار دیا جائے گا کہ اپنے قارئین سے اب ہمارا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹ سکے گا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ماہنامہ ”جام نور“ کے اجراء کا یہ مسرت انگیز موقع دراصل کلکتہ، ہوڑہ، چٹکل ایریا اور جمشید پور کے ان بے شمار ہمدردوں اور نغمسار دوستوں کی ہمت افزائی اور چارہ گری کا نتیجہ ہے جنہوں نے بحرانی دور میں ہمارے حوصلوں کو ٹوٹنے سے بچایا۔ خدائے کردگار ان تمام حضرات کو دینی رشتے کی بنیاد پر میرے ساتھ حسن سلوک کی بہترین جزا عطا فرمائے۔ آمین!

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، فروری ۱۹۶۷ء)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

انسان کی زندگی بھی کتنے متضاد حالات کا مجموعہ ہوتی ہے، اس کا تجربہ ان لوگوں کو خاص طور پر ہوگا جو عوامی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، پردہ غیب کی چارہ گری شریک حال نہ ہو تو آدمی پاگل ہو جائے گا۔ ”جام نور“ کی پہلی کاپی جب پریس جارہی تھی تو ماحول پر مشکلات کا اتنا گھنا اندھیرا تھا کہ قدم رکھنے کے لیے کوئی صاف جگہ نظر نہیں آرہی تھی، جو امر سب سے زیادہ پریشان کن تھا وہ موانع کے ہجوم میں اپنی تنہائی کا احساس تھا۔

نئے ساتھی:۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔ چند قابل اعتماد دوستوں کی رفاقت نے میرا حوصلہ بہت بلند کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ذہنی اخلاص اور باہمی تعاون کا یہ حلقہ وسیع ہوتا جائے گا۔ امیر کشور خطابت سبحان الہند حضرت مولانا ابوالوفا صاحب فصیحی غازی پوری نے قلمی رفاقت کے لیے ادارت خصوصی کا منصب قبول کر لیا ہے، موصوف کے کئی رشحات قلم منظر عام پر آ جانے کے بعد اب یہ امر صیغہ راز میں نہیں رہ گیا ہے کہ زبان کے ساتھ قلم کا سحر بھی قدرت نے انہیں عطا کیا ہے۔

اپنے تبلیغی دوروں میں مولانا موصوف نے ”جام نور“ کی توسیع اور اشاعت کے لیے کافی یقین دلایا ہے، علاوہ ازیں رئیس الملتہ جناب صوفی شاہ قربان علی صاحب تیغی جنہوں نے کلکتہ کی سرزمین پر معراج کافرنس اور سنی جمعیتہ العلماء کافرنس کی کامیابی میں نمایاں حصہ لے کر بنگال کی سنی دنیا میں ایک اہم جگہ حاصل کر لی ہے، وہ بھی اپنی تمام صلاحیتوں اور جملہ وسائل و ذرائع کے ساتھ ”جام نور“ کی رفاقت کے لیے کھڑے ہو گئے ہیں ”جام نور“ کے مستقبل کے بارے میں موصوف کے بلند حوصلوں کی تفصیل معلوم کر کے بیساختہ دل

سے دعا نکلتی ہے کہ خدا انہیں جلد تکمیل کو پہنچائے۔

پھر علمائے کرام ائمہ مساجد اور ہر حلقے سے نمگسار دوستوں کے پیشتر پیغامات موصول ہو رہے ہیں کہ اب کسی قیمت پر بھی ”جام نور“ کو مشکلات سے دوچار ہونے نہیں دیا جائے گا ”سیاست جدید“ کانپور کے ایڈیٹر حضرت مولانا اسحاق علی صاحب بھی جام نور کی توسیع و اشاعت میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں، مولیٰ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے، ادارہ اس سلسلہ میں ان کا نہایت مشکور ہے۔

وقت کی بنیادی ضرورت:- جس ضرورت کے احساس نے میری زندگی کو صحافتی دور میں داخل کیا ہے اس کے متعلق ذیل کی چند سطریں غور سے پڑھیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں ہر جگہ اہل سنت و جماعت کی عظیم اکثریت ہے، اس کا اندازہ ان مذہبی اور روحانی تقریب سے ہوتا ہے جو یکساں طور پر ہندوستان کے سارے طول و عرض میں منائی جاتی ہیں۔ جب کہ اہل سنت کے علاوہ کبھی کوئی فرقہ انہیں اپنی مذہبی تقریب قرار نہیں دیتا۔ لیکن ہم تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اثر کے لحاظ سے قطعاً اقلیت میں ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب تک ہم اپنے قرار واقعی وجود کا یقین ہی نہیں دلا سکے ہیں۔ دنیا کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے یہاں تین چار متوازی جماعتوں کی تنظیم ہے، پھر بھی ہم منظم نہیں ہیں۔ ہر جماعت کی ناکامی کے بعد ایک نئی جماعت اس امید کے ساتھ وجود میں لائی گئی کہ شاید اس کے ذریعہ ہمارا خواب شرمندہ تکمیل ہو جائے، لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اپنے پیش روؤں سے جا ملی۔

اس خطرناک اور نتائج آزمودہ اقدام کے لیے میں ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ اپنے جماعتی مسائل سے نمٹنے کے لیے اب کوئی پانچویں جماعت بنائی جائے۔ آج کی صحبت میں صرف اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے یہاں کچھ ایسی چیزوں کا ضرور فقدان ہے جو کسی بھی جماعتی تنظیم کے لیے ناگزیر ہے، مثال کے طور پر ہم ملک میں ذہنی اعتبار سے کارکنوں کا کوئی دستہ تیار کیے بغیر کل ہند سطح پر اپنی جماعتوں کے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف مذہبی اعتقاد کی بجگہ کسی بھی دستوری

جماعت کا بوجھ اٹھانے کے لیے کافی ہے، حالانکہ مذہبی خیالات کی یگانگت اور کسی تنظیمی جماعت کے اغراض سے اتفاق، دونوں میں نہایت واضح فرق ہے۔ کسی بھی جماعتی تنظیم کو بروئے کار لانے کے لیے جب تک افراد کے درمیان نظام جماعت کے ساتھ ذہنی ارتباط، جذباتی لگن، والہانہ آمادگی، باطنی اخلاص اور قربانیوں کی سچی تڑپ موجود نہ ہو عوامی سطح پر کسی مضبوط قیادت کی نمو اور بکھرے ہوئے شیرازوں کی یکجائی ناممکن ہے۔ جب تک کہ ہم دلنشین اور پرکشش لٹریچر کے ذریعہ سنی نوجوانوں کا ذہن، جماعتی مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیتے ہماری کوئی تنظیم قابل ذکر کردار کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ صحیح العقیدہ حلقوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ہم ایک بے داغ اور نکھرا ہوا لٹریچر جماعت کے حوالہ کریں گے۔

سیاسی انقلاب:- سات دنوں کے اندر ملک میں اچانک جو سیاسی انقلاب رونما ہوا ہے اس نے ہر شخص کو سکتے میں ڈال دیا ہے۔ اس متوقع یا غیر متوقع انقلاب پر اکثر حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور عام طور پر امید باندھی جا رہی ہے کہ اب ہندوستانی عوام کا کال کٹ جائے گا۔ لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ برطانوی سامراج کے عہد میں بھی اسی طرح کے نعرے کانگریس بلند کرتی تھی جو آج اپوزیشن کی زبانوں پر ہیں لیکن وقت نے بتا دیا کہ نعرہ اور کردار کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اگر نئے حکمران بھی مسند اقتدار پر آنے کے بعد اسی روش پر چلے تو صرف کرسیوں کے تبادلے سے ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ کانگریس کی، عوام پر اپنی اجارہ داری کا جو غرور تھا وہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آنکھ نہیں کھلی تو کانگریس کو فنا کے گھاٹ اترنے سے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ نزاکت و عبرت کی یہ گھڑی کانگریس سے زیادہ ان مخالف پارٹیوں کے لیے ہے جو پہلی بار کئی صوبوں میں اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رہی ہیں۔ متضاد نقطہ ہائے نظر رکھنے والی جماعتوں کا باہمی اتحاد کچھ آسان نہیں ہے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، مارچ ۱۹۶۷ء)

بھگی پلکوں کے سائے میں خراج عقیدت

پڑے ہیں خون کے دھبے پڑا رہنے دے دامن پر
تجھے دیکھیں گے سب محشر میں دامن کون دیکھے گا؟

ملک کے طول و عرض میں ”جام نور“ کے ”شہید کر بلا نمبر“ کے لیے شوق کی آنکھیں
بچھائے ہوئے عاشقان رسول جتنی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے آج وہ گھڑی ختم ہو گئی۔
اب یہ فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ ہم اپنی پیش کش میں کس حد تک کامیاب ہیں۔

پنجاب ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ:۔ یہ الم انگیز خبر آپ نے بھی سنی ہوگی کہ پنجاب ہائی
کورٹ نے رسوائے عالم کتاب ”خلافت معاویہ و یزید“ کے حق میں فیصلہ دے کر پھر
ہمارے سوئے ہوئے جذبہ عقیدت کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ حقائق و دلائل کیا ہیں جن کی بنیاد پر
کتاب مذکور کی مضبوطی کے خلاف فیصلہ صادر کیا گیا ہے ان کا صحیح علم فیصلے کی مسل ہی دیکھ کر
ہو سکے گا، لیکن بہر حال سپریم کورٹ میں اس فیصلے کی اپیل کرنا چاہئے۔ اب ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ شہدائے حرم کی مقدس روئیں آج بھی اپنے ناموس کے تحفظ کے لیے کسی باطل اقتدار
کا ممنون کرم نہیں بننا چاہتیں، لیکن کم از کم ہماری شرم عقیدت کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ ہم
قانون کے پاسبانوں کو توجہ دلائیں کہ جس ملک کے مجموعہ تعزیرات میں دشنام طرازو اور
دریدہ دہن گستاخوں کے لیے کوئی لگام نہیں ہے اسے انسانی حقوق کا محافظ ہرگز نہیں کہا
جاسکتا۔ کسی بے گناہ کا قتل بہر حال ایک جرم ہے، جس کے تدارک کے لیے قانون کا ہونا

ناگزیر ہے، لیکن بعض قتل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ خون نہیں ٹپکتا، خنجر کی نوک پر سرخی نہیں ہوتی
لیکن عقیدت کی خاک پر لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ کسی بھی ملت کے پیشواؤں کی اہانت،
اس کے چاہنے والوں کے حق میں جہاں اس طرح کا ”قتل خاموش“ ہے وہاں جذبات کے
اشتعال کے نتیجے میں خاک و خون میں تڑپانے والے ہزاروں قتل محسوس کا پیش خیمہ بھی
ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس جرم کے بطن سے دل آزاری، جذبات کی خونریزی
اور قتل کے محرکات جنم لیتے ہوں اس کے تدارک کے لیے کوئی واضح قانون نہ بنایا جائے۔
اگر پنجاب ہائی کورٹ کا فیصلہ اس بنیاد پر ہے کہ اس طرح کی دل آزاریوں کا سلسلہ روکنے
کے لیے مجموعہ تعزیرات میں کوئی واضح قانون نہیں ہے تو یہ قانون فوراً بننا چاہیے اور اگر
عباسی کے موقف کی حمایت کی بنیاد پر ہے تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اسلام کی
کسی تاریخی اور مذہبی نزاع کا فیصلہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو تیرہ سو برس کے علمی ذخائر کا
وسیع مطالعہ رکھتے ہوں۔ میرے خیال میں قانون کی کرسیوں پر بیٹھنے والے حضرات کا یہ
منصب نہیں ہے۔

سنی مجلس اوقاف:۔ ہندوستان میں اربوں روپے کی جائیداد جس بے دردی سے اس
محکمے کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے، اس کے خلاف بارہا احتجاج کیا گیا ہے، لیکن جب
حکومت ہی کی یہ پالیسی ہو کہ مسلمانوں کے پنپنے کا کوئی جائز ذریعہ محفوظ حالت میں رہنے نہ
دیا جائے تو نالہ و فریاد سے کیا ہوتا ہے؟

اس محکمے کی سیاست کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ سنی اوقاف پر حکومت
نواز طبقے کی اجارہ داری بحال رکھنے کے لیے دیانت و قانون کے خون ناحق سے بھی دریغ
نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجالس کی تشکیل میں جمعیتہ العلماء کو خاص اہمیت دی جاتی ہے جس
کے نتیجے میں سنی مسلمانوں کی مذہبی زندگی آئے دن جذبہ انتقام کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔
رشوت، اثر و رسوخ، سفارش اور عقائد کی ہم آہنگی کی بنیادوں پر دیدہ و دانستہ مساجد، مدارس
اور عید گاہوں کے نظم و نسق سے سنی مسلمانوں کو بے دخل کیا جاتا ہے اور رائے عامہ کو کچل
کر صرف ذاتی اور جماعتی تعلق کی بنیاد پر دیے ہوئے اختیارات کا استعمال ہوتا ہے۔

کانپور کی شرمناک مثال:- کانپور کا حادثہ لوگوں کو یاد ہوگا، وہاں چار لاکھ سنی رائے عامہ کے خلاف ایک عید گاہ کی کمیٹی، آفس میں بیٹھ کر تشکیل دیدی گئی اور اسے کورٹ کے ذریعے ان کے سروں پر مسلط کر دیا گیا، تین مہینے تک جلسہ و جلوس کے ذریعے اس کے خلاف مسلسل احتجاج ہوتا رہا، لیکن عید کی صبح کو سنی مجلس اوقاف کی مدد سے قانون کا سہارا لے کر خود ساختہ عید گاہ کمیٹی نے عام مسلمانوں کے جذبات کا جو قتل عام کیا وہ کانپور میں جا کر معلوم کیجیے۔

جمشید پور کا تازہ واقعہ:- گولموری محلے کی مسجد کے نظم و نسق کے سلسلے میں دو گروپ کے درمیان بہت دنوں سے نزاع چل رہا تھا، ایک گروپ کے ساتھ وہاں کے عوام کی اکثریت تھی، جب کہ دوسرا گروپ چند دولت مند افراد پر مشتمل تھا، جس کے سربراہ ضلع جمعیتہ العلما کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں بیٹھ کر سات افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور اپنے سیاسی تعلقات، اثر و رسوخ اور پیسوں کے بل پر بہار سنی مجلس اوقاف پٹنہ سے ساز باز کر کے اپنی خود ساختہ کمیٹی کو منظور کرا لیا، مجلس نے بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ واقعی کوئی عوامی الیکشن ہوا ہے یا نہیں، صرف پرائیوٹ تعلقات کی بنیاد پر اپنے اختیار کا ناجائز استعمال کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ دوسرے گروپ نے صدر مجلس سے اپیل کی ہے کہ وہ عوامی سطح پر معاملے کی انکوائری کریں۔ اس نئی شرارت کے نتیجے میں اس وقت وہاں دفعہ ۷۰ نافذ ہے اور مسجد کا انتظام قتل میں پڑا ہوا ہے۔

فریب و عیاری کی ایک اور شرمناک تصویر:- جمشید پور کی سب سے بڑی عید گاہ جو محلہ دھتکڈیہ میں ہے، تقریباً چودہ سال ہو گئے کہ وہاں کا امام بد عقیدگی اور اہانت رسول کے الزام میں متفقہ طور پر عیدین کی امامت سے معزول کر دیا گیا۔ اب ہر سال امامت کے لیے باہر سے صحیح العقیدہ عالم بلوائے جاتے ہیں۔ اس عید گاہ کی ایک کمیٹی ہے جس کا انتخاب ہر سال شب برأت کے موقع پر علاقے کے ہزاروں مسلمانوں کے اجتماع میں ہوا کرتا ہے جو حسب دستور امسال بھی ہوا۔ عید گاہ کمیٹی کی ان خدمات سے سارا شہر واقف ہے کہ اس نے ٹاٹا کمپنی سے زمین حاصل کر کے عید گاہ کی تعمیر جدید کی ہے اور وہ ہر سال صفائی، مرمت اور عیدین کے موقع پر نماز سے متعلق سارا انتظام کرتی ہے۔ امسال محلے کی مسجد والوں نے

ایک نیا گل کھلایا، بقرعید سے دودن پہلے، ایس، ڈی او کورٹ میں اس مضمون کی ایک درخواست گزاری کہ بہار سنی وقف بورڈ پٹنہ نے ہمارے سکریٹری کو اختیار دیا ہے کہ عید گاہ میں وہ جسے چاہے امامت کے لیے کھڑا کرے۔ لہذا امسال ہماری کمیٹی نے طے کیا ہے کہ فلاں شخص کو کھڑا کیا جائے گا۔ (جسے قیام امن کی خاطر چودہ سال سے معزول کر دیا گیا ہے) انکوائری کے بعد پولیس نے نقض امن کے اندیشے سے انہیں اپنا امام کھڑا کرنے سے روک دیا اور حسب دستور باہر کے امام نے دھتکڈیہ عید گاہ میں نماز پڑھائی۔ بقرعید گزر جانے کے بعد جب ان کی درخواست کی تفصیلات معلوم کی گئیں تو یہ راز منکشف ہوا کہ ان لوگوں نے گھر میں بیٹھ کر ایک جعلی عید گاہ کمیٹی بنالی ہے اور انہوں نے ناجائز ذرائع سے کام لے کر وقف بورڈ پٹنہ سے اسے منظور بھی کرا لیا۔ مسلمانان جمشید پور کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ نہ مسجد والوں کو یہ خیال آیا کہ عوامی حق کی یہ چوری کسی دن پکڑی بھی جاسکتی ہے، نہ ہی وقف بورڈ والوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ خفیہ ساز باز کبھی منظر عام پر بھی آئے گی۔ کسی بھی اندیشے کی پرواہ کیے بغیر دونوں نے نہایت سنسنی خیز، بھیانک اور چوٹکا دینے والے کردار کا ثبوت دیا۔

عام مسلمانوں کے تاثرات:- اس حادثے کے نتیجے میں اب سنی مجلس اوقاف پٹنہ سے عام مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ اداروں کا ہر کارکن اور سوسائٹی کا ہر ممبر اپنی جگہ چونک گیا ہے کہ بغیر علم و اطلاع کے اسی طرح جعلی قسم کی متوازی کمیٹیاں وقف بورڈ کی طرف سے عوام پر جبراً مسلط کی جاتی رہیں تو دنیا سے دیانت و امانت کا جنازہ نکل جائے گا اور وقف بورڈ کے زیر اثر کسی بھی عوامی ادارے کا چلانا ناممکن ہو جائے گا۔ سنی وقف بورڈ پٹنہ کے ذمہ دار حضرات کو ان سنگین واقعات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ تحقیقات کر کے فوراً ان لوگوں کے خلاف نوٹس لیں جن کے ہاتھ ان سازشوں میں ملوث ہیں۔ اخبار ”سنگم“ پٹنہ کے تازہ شمارے میں جمشید پور کی اس عید گاہ سے متعلق جو مراسلہ شائع ہوا ہے وہ سرتاسر غلط بیانی اور دروغ گوئی پر مبنی ہے، سنگم عوام کا اخبار ہے اسے پارٹی نہیں بننا چاہیے۔ ادارہ سنگم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اپنے نامہ نگاروں کو ہدایت کر دیں کہ

واقعات کی خبر رسانی میں مقامی عصبيت کا شکار نہ ہوں۔

آل انڈیا سنی جمعیت العلماء ممبئی:۔ مولانا نصرت اللہ عباسی ناظم جماعت اور مولانا عاصم اشرفی ناظم نشریات کی اطلاع کے مطابق حضرت مجاہد ملت، حضرت استاذ العلماء اور حضرت مولانا حامد علی صاحب کو نہایت شوکت و اعزاز کے ساتھ دیار حبیب کے مبارک سفر پر رخصت کیا گیا، ممبئی میں کئی الوداعی جلسوں کو ان بزرگوں نے خطاب بھی کیا۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ان حضرات کی واپسی کے بعد سنی اوقاف کے نظم و نسق کا حق سنی عوام کے ہاتھوں میں منتقل کرانے کے لیے سنی جمعیت العلماء وسیع پیمانے پر تحریک چلائے گی..... ادارہ ”جام نور“ سنی جمعیت العلماء کے ہر تعمیری اقدام اور اجتماعی حرکت عمل کا پرتپاک خیر مقدم کرے گا۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، اپریل ۱۹۶۷ء)

سجدہ شکر

”شہید کر بلا نمبر“ نے ملک کے طول و عرض میں جو اپنے اثرات چھوڑے ہیں اور جس طرح ہر حلقے میں اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا ہے، وہ صرف فضل خداوندی ہے جس کے لیے قلم کی پیشانی ہمیشہ سجدہ ریز رہے گی۔ انتہائی حیرت کے ساتھ ہم نے رحمت تمام کا یہ تماشا دیکھا کہ صرف چند گھنٹے کے عرصے میں شہید کر بلا نمبر کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں، لیکن آج تک ہمیں اس امر کا قلق ہے کہ مٹی آرڈر، خطوط اور بذات خود دفتر میں تشریف لانے والے ہزاروں شائقین کی آرزوئے شوق ہم پوری نہیں کر سکے اور ہمیں مؤدبانہ معذرت کے ساتھ انہیں واپس لوٹانا پڑا۔ ادارہ جام نور کو شہید کر بلا نمبر کے لیے لاکھوں میل میں پھیلی ہوئی بے چینیوں کا اگر وقت سے پہلے اندازہ ہو گیا ہوتا تو آج ہم جس پشیمانی سے دوچار ہو گئے ہیں یہ صورت حال پیش نہ آتی۔ بہر حال حسرت زدہ حضرات کی اشک شوقی کے لیے شہید کر بلا نمبر کا یہ ضمیمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بھی ہمارے شائقین کے معیار ذوق پر پورا اترے گا۔ شہید کر بلا نمبر کی اشاعت پر جن بزرگوں اور دوستوں نے زبانی یا تحریری مبارک بادی اور تحسین کے پیغامات سے ادارہ کو نوازا ہے ان کے لیے جذبہ شکر سے ہم اپنے دلوں کو لبریز پاتے ہیں۔

کلکتہ کی مجالس محرم:۔ یہ معلوم کر کے ہمارے جذبات کو ناقابل برداشت ٹھیس پہنچی کہ اس سال مجالس محرم میں شہر کے بعض نمایاں حضرات نے واقعہ شہادت پر نہایت جارحانہ تقریریں کی ہیں۔ شہید کر بلا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جو اسٹیج سجایا گیا وہاں سے انھوں نے یزیدی وکالت کا فرض انجام دیا ہے۔ واقعہ کر بلا کے پس منظر کو طلب جاہ پر مبنی

قرار دے کر امام عالی مقام کے قابل فخر کردار کو مجروح کیا ہے اور کھلے بندوں یزید کی حمایت و صفائی میں حقائق کی تکذیب کی ہے۔ بعض مقامات پر تقریروں کے دلخراش اور مجروح کن حصوں پر شور ہنگامہ بھی ہوا، مجمع میں برہمی پھیل گئی اور مجبوراً تقریروں کا سلسلہ بند کرنا پڑا۔ ویسے یہ ذمہ داری بانیان مجالس کی ہے کہ وہ امام حسین کی مجلسوں میں یزید کے حامیوں کو بلا کر دیدہ و دانستہ مسلمانوں کے جذبات کا خون نہ کرائیں۔

لیکن اخلاقی طور پر ہمیں ان پیشہ ور مقررین سے اتنا ضرور کہنا ہے کہ جرأت کر کے انہیں داعیوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ ذکر شہادت کے اسٹیج پر وہ یزید کی حمایت کے موقف سے تقریریں کریں گے، اس کے بعد بھی داعیوں کو ان کی شرکت پر اصرار ہو تو ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، لیکن یہ بدترین قسم کی اخلاقی گراوٹ اور ضمیر فروشی ہے کہ وہ محض پیشے کے طور پر شریک جلسہ ہو کر علی الرغم ان جذبات عقیدت کو مجروح کرتے ہیں جو ان مجالس کے پیچھے کارفرما ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں ایک طبقہ موجود ہے جو اسلام کے اساطین اولین اور خلفائے راشدین پر برسر منبر سب و شتم کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے، اسی طرح امام عالی مقام کی مذمت کو بھی اگر کوئی بد بخت اپنا ذہنی شعار بنالے تو آج کے اس دور الحاد میں کون زبان و قلم پر پہرہ بٹھا سکتا ہے، لیکن ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کو اندھیرے میں نہیں اجالے میں آنا چاہیے تاکہ محبان اہل بیت کے لیے ان کے صحیح تعارف میں کسی طرح کا کوئی حجاب حائل نہ ہو۔

سنی اوقاف:- گزشتہ شمارے میں ان حقائق پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں کہ کس طرح محکمہ اوقاف کے ہاتھوں بزرگان سلف اور شہان اسلام کی یادگاروں اور وقف کردہ جائیدادوں کو پامال کیا جا رہا ہے اور قانون کی پناہ گاہوں میں بیٹھ کر کس بے فکری سے حرمت اسلام کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ اب اس سلسلے میں ایک تازہ اور نہایت اندوہناک خبر سنئے۔ سنی جمعیۃ العلماء بمبئی کے مرکزی دفتر نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ اعداد و شمار فراہم کر کے پریس کو یہ اطلاع بھیجی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ملت کی بہبود کے لیے ہندوستان میں جو اوقاف چھوڑے تھے ان کی مالیت کا تخمینہ سو ارب بیس کروڑ روپے تھے۔ اب یہ معلوم کر کے آپ کو پسینہ نکل آئے گا کہ محکمہ اوقاف اور بددیانت و نااہل کارپردازوں کے

ہاتھوں، چورانوں نے ارب کے اوقاف تباہ ہو گئے، فروخت کر دیے گئے۔ غیروں کے قبضے میں چلے گئے، بے توجہی کے باعث ضائع ہو گئے، اور بنام اوقاف زمین کے نقشے سے بالکل ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اب صرف چھ ارب کے اوقاف باقی رہ گئے ہیں، اگر اسے بھی بچانے کی فکر نہیں کی گئی تو عہد رفتہ کا یہ ٹٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ ناظم نشریات مولانا عاصم اشرفی نے اطلاع دی ہے کہ سنی جمعیۃ العلماء وقت کے اس عظیم اور لرزہ خیز سوال پر غور کرنے کے لیے اکتوبر کے پہلے ہفتے میں بمبئی میں مشاہیر اہل سنت اور عمائدین ملک و ملت کا ایک نہایت اہم اجلاس منعقد کر رہی ہے۔ میرے دل کی بہترین خواہشیں اور زبان و قلم کی تمام صلاحیتیں اس عظیم الشان اقدام کے ساتھ ہیں۔

کاروان حرم کی واپسی:- اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سربراہ اتقیا میر لشکر عاشقاں حضرت استاذ العلماء شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور ۲۴ اپریل کو دربار حبیب کے مقدس سفر سے کامران و شاد کام واپس لوٹ آئے۔ بمبئی کے ساحل پر عمائدین اہل سنت نے ان کا نہایت عظیم الشان اور پر جوش خیر مقدم کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ اہل بمبئی کے اصرار شوق پر حضرت موصوف وہاں کچھ دنوں تک قیام فرمائیں گے۔ دن، مشتاقان زیارت کے ہجوم اور راتیں سرگزشت عشق اور روداد جلوہ حرم کے بیان میں گزر رہی ہیں۔ علم و عرفان کی لگارتار بارش سے اس وقت بمبئی کی سرزمین جل تھل ہو گئی ہے۔ برادر گرامی مولانا حکیم الحاج عبد الغفور صاحب اور حضرت استاذ محترم کے محبت مخلص الحاج جناب بیکل اتساہی بھی شریک سفر ہیں، بمبئی سے فارغ ہو کر حضرت استاذ العلماء سیدھے اپنے وطن مالوف مراد آباد تشریف لے جائیں گے، وہاں سے اپنے فیضان علم کی راجدھانی ”مبارکپور“ کا سفر فرمائیں گے۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ مئی کے آخری عشرہ میں عشق و ایمان کے پیکر سرفروش حضور مجاہد ملت دامت برکاتہم تشریف لارہے ہیں۔ موصوف کے ہمراہ شب پور ہوٹہ کے مشہور سنی رہنما حضرت مولانا الحاج امین الدین صاحب قادری اور دیگر احباب بھی ہیں۔ خدائے قدیر یہ فرخندہ فال ایام ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ آمین

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، مئی ۱۹۶۷ء)

عشق کی فتح مبین

لو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا

آج کچھ اور بڑھادی گئی قیمت اپنی

کل تک لوگ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے تھے کہ کونین کا دارالسلطنت گنبد خضرا کی چھاؤں میں ہے، لیکن اب جب کہ دلوں کا یہ عقیدہ پیکر محسوس بن کر سامنے آ گیا ہے تو کس کی شامت آئی ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ جھٹلائے، ویسے جھٹلانے کے لیے تو آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی جھٹلایا جاسکتا ہے، لیکن اپنی نظر کو جھٹلانا آسان نہیں ہے۔

اس داستان حیرت فضا کی تفصیل یہ ہے کہ سرگروہ اتقیا، امیر لشکر عاشقاں حضرت استاذ العلماء شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور ایک عرصہ دراز سے دیار حبیب کی زیارت کے لیے بیتاب تھے، لیکن ساتھ ہی دل کا یہ بھی اصرار تھا کہ پروانہ راہداری بغیر فوٹو کے حاصل ہو جائے۔

نیاز مندوں نے ہزار التجا کی کہ بین الاقوامی قانون سے کسی فرد خاص کا استثنائاً ممکن کی حد تک دشوار ہے، اول تو سلف ہی سے چلا آ رہا ہے کہ اہل سنت کے اکابر کا دنیا کی کسی بھی حکومت سے کوئی نیاز مندانہ رشتہ نہیں ہے۔ بالفرض حکومت ہند نے بغیر فوٹو کے جانے کی اجازت بھی دے دی تو سعودی عرب پر ہم کیوں کر اثر انداز ہو سکیں گے، جب کہ وہاں کی حکومت عقیدہ ہمیں اپنا حریف بھی سمجھتی ہے، لیکن عشق کا حوصلہ جنوں خیز ملاحظہ فرمائیے کہ راہ کی ان ساری رکاوٹوں کے باوجود ”دل دیوانہ“ اپنی ضد پہ قائم رہا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد اس مرحلے کی سلسلہ جنبانی کے لیے ایک انجانے یقین کی روشنی میں قدم عالم اسباب کی

طرف اٹھے۔ حسان الہند حضرت بیکل اتساہی جن کی دل آویز اور سحر طراز شخصیت کا اثر فقیر کی کنیا سے لے کر صدر مملکت کے ایوان تک یکساں طور پر ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ انہوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھالیا، کوششوں کا سلسلہ آنجہانی پنڈت نہرو سے شروع ہو کر شری لال بہادر شاستری تک پہنچا، یہاں تک کہ شریتمی اندرا گاندھی کے عہد وزارت میں ہندوستان کے محکمہ خارجہ نے اس سوال پر سعودی عرب سے رابطہ قائم کیا۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے درخواست کی فائل سعودی گورنمنٹ کے سربراہ سلطان امیر فیصل کے سامنے پیش کی گئی۔ انہوں نے اپنے خصوصی دستخط سے جواب ارسال کیا کہ ہماری حکومت شیخ الحدیث کو بغیر فوٹو کے حج زیارت کے لیے حجاز میں داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ اجازت نامہ بالکل پہلا اور آخری ہے۔ سعودی عرب کا جواب موصول ہونے کے بعد حکومت ہند نے بھی اجازت دے دی اور مغل لائن نے سیٹ ریزرو کر لیا۔ کارروائی کے آخری مرحلے میں پہنچتے ہی سارے ملک میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔

مغل لائن کی دی ہوئی تاریخ پر جب حضرت استاذ العلماء تیار ہو کر بمبئی پہنچے تو اچانک یہ خبر معلوم ہوئی کہ سعودی حکومت کا فیصلہ تو نصل بمبئی بغیر فوٹو کے ویزا دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دلوں پر بجلی گر پڑی، ارمانوں کا خون ہو کے رہ گیا۔ داستان کا یہی وہ حصہ ہے جسے ہم ”عشق کی فتح مبین“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ گہرائی میں اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ دیوبندی حلقوں کے تمام ذی اثر حضرات نے متحدہ طور پر سعودی حکومت کے تو نصل سے درخواست کی ہے کہ سعودی گورنمنٹ کے ساتھ ہماری جماعت کا دیرینہ نیاز مند یوں کا حال آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے، لیکن اس غیر معمولی تعلق کے باوجود ہماری جماعت کے بعض اکابر کو انتہائی جدوجہد کے بعد بھی سفر حج کے لیے فوٹو سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اب یہ اعزاز ایک ”بدعتی مولوی“ کو دیا جا رہا ہے جو نجدی عقائد کا سب سے بڑا حریف ہے، اگر یہ اعزاز واپس نہ لیا گیا تو ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ تو نصل پر دیوبندی ریشہ دوانیوں کا اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ اس نے اپنے تئیں ویزا نہ دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا، کئی دن تک لطائف الخلیل سے ٹالتا رہا، یہاں تک کہ وہ تاریخ آ گئی جس دن جہاز کھلنے والا ہے۔

اب فاصلے کا شمار گھنٹوں میں رہ گیا لیکن اب تک ویزا نہیں ملا۔

بہی وہ نازک گھڑی تھی جب کہ اہل بمبئی نے کھلی آنکھوں سے ایک سچے نائب رسول کی روحانی برتری کا تماشا دیکھا، جب دو گھنٹے باقی رہ گئے تو بعض سادہ لوح نیاز مندوں نے مشورہ دیا کہ اب بغیر فوٹو کھینچوائے کام بنتا نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر فرط جلال سے حضرت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، کچی نیند جاگنے والے محشر اضطراب کو دوبارہ سلا دینا ممکن نہیں تھا۔ اب مادی تدبیروں کا وقت ختم ہو چکا تھا، دل گداز بے چینوں کے عالم میں حضرت نے اپنا کمرہ خالی کر کر اندر سے دروازہ بند کر لیا، پلک جھپکتے ہی آہوں کا قافلہ مدینہ پہنچ گیا، اب دل دیوانہ فرماں روا کے کونین کی چوکھٹ پر تھا۔ عاشق پرسوز نے کیا فریاد کی، سرکار نے برستی ہوئی آنکھوں پر کس طرح رحمت کی آستین رکھی، یہ سارا ماجرا صیغہ راز میں ہے۔ باہر کھڑے رہنے والے ہجوم کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو حضرت بیکل اتساہی ویزا لیے کھڑے تھے۔ وفور جذبات میں وہ صرف اتنا کہہ سکے ”نئی دہلی سے سعودی سفیر کا ٹیلی فون آیا کہ شیخ الحدیث کو فوراً ویزا دیا جائے اور بے تحاشا قدموں پر گر پڑے۔ حضرت نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ دوست تو دوست، دشمنوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ جن خاک نشینوں کے طرفدار گنبد خضرا کے تاجدار ہیں ان پر فتح پانا مشکل ہے۔

نگاہ یاس مری کام کر گئی آخر

رلا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

حضرت بیکل اتساہی کی قابل رشک فیروز بختی پر ہم دل کے بیکراں اخلاص کے ساتھ انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، جون ۱۹۶۷ء)

روحانی انقلاب کا موسم

تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیے طوفان شوق
اک تبسم اس قدر جلوؤں کی طغیانی کے ساتھ

ربیع الاول کا مہینہ اس موسم کی یاد دلاتا ہے جب کہ خاکدان گیتی کے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آئی۔ قلب و روح کی توانائیوں کا چشمہ پھوٹا اور فاران کے افق سے خورشید رسالت کی وہ کرن چمکی جس کی روشنی سے گیتی کے ذرے ذرے پر سحر کا اجالا پھیل گیا۔ فراز عرش سے اترنے والے مسیحا کی آواز نے ہستی کی ڈوبتی ہوئی نبض میں حیات کی نئی تپش پیدا کی اور دائمی ہلاکتوں کے دہانے پر کھڑے ہونے والے انسانوں کو دل جیتنے والے پیغام کے ذریعہ بربادیوں کے ہولناک انجام سے بچا لیا۔ سلام ہو اس روح مقدس پر جس نے دنیا میں مسلم نام کی ایک نئی قوم کو وجود بخشا اور اسے خاک مذلت کی پستیوں سے اٹھا کر عظمتوں کے اوج ثریا پر پہنچا دیا۔ درود ہو اس سلطان کونین پر جس کے صحرائیں غلاموں نے قوموں کی تقدیر بدل دی اور تکبیر کی صداؤں سے اقطار ارض میں تہلکہ ڈال دیا، جن کی خارا شگاف تلواروں نے دنیا کی مغرور طاقتوں کے پر نچے اڑا دیے اور انہیں سطوت حق کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ رحمت و نور کی موسلا دھار بارش ہو اس قصر معلیٰ پر جس کا سبز گنبد دنیا کے نوے کروڑ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ہے اور جس کے سایے میں فرماں روا کے کونین کی وہ جلوہ گاہ ناز ہے جس کے صرف تصور سے عشاق کے دلوں میں کیف و سرور کا اجالا رہتا ہے۔ خراج عقیدت نچھاور ہو اس خسرو کے کائنات کی چوکھٹ پر جہاں آٹھوں پہر پر امیدوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور دامن پھیلائے والے رحمتوں کی خیرات سے نہال ہو جاتے ہیں اور

جہاں کی اڑتی ہوئی خاک کو نین کے سرفراز چہروں کے لیے غارۂ جمال وزیبائی ہے۔ عشق و ایمان کی تحسین ہوں اس پیکرِ رحمت کی جناب میں جس کی نظر کا ایک اشارہ گنہگاروں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کا قرار ہے اور جس نے اقلیمِ محبت کے خاک نشینوں کو چشمِ زدن میں عظمتوں کے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ آج بھی جس کے دامن کی چارہ گری آشفۃِ حالوں کی تسکین کا قیمتی سرمایہ ہے۔ خدا سلامت رکھے اس جذبہٴ غلامی کو جس نشے سے مخمور ہو کر ہم گنبدِ خضرا کے شہرِ یار کو اپنا آقا کہتے ہیں اور ہمارے دل کی دنیا جھوم اٹھتی ہے۔ یہی جذبہ جب تک سلامت تھا دنیا کی سروری ہمارے قدموں کی ٹھوکر میں تھی اور ہم میر کارواں کہلاتے تھے اور جب سے عقیدہٴ فکر کے الحاد نے حبِ رسول کا نشیمن تاراج کر دیا اور سرورِ مجتبیٰ کی عظمتِ خداداد سے انحراف کی جسارت پیدا ہوئی، قدرت نے ہمارے ہاتھوں سے اپنا بخشا ہوا اعزاز چھین لیا۔ پہلے ہمارا جہاں نقشِ قدم تھا اب وہاں ماتھا ٹکینے کی بھی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ خدائے قدیر اپنے محبوب کے صدقے میں اپنی رحمتوں کا اعزاز ہمیں واپس کر دے اور پھر ایک بار ہم اسلام کا پرچم کائنات گیتی کے بحرِ و بر پر لہرائیں۔

(ماہنامہ جامِ نور، کلکتہ، جولائی ۱۹۶۷ء)

نازک گھڑی

گردشِ ایام یا شامتِ اعمال نے ہمیں آج جس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، یہ ہماری تاریخ کا بالکل پہلا حادثہ ہے۔ عالمی سطح پر کبھی ہم اتنے رسوا اور بے وقار نہیں ہوئے جتنے آج ہیں۔ اسرائیل اور عرب جنگ کے ہولناک نتائج نے ہماری چھپی ہوئی کمزوریوں کو بالکل برہنہ کر دیا ہے۔

اب اپنے نظامِ زندگی میں صرف جزوی تبدیلی سے کام نہیں چل سکتا، اپنے آپ کو بنیاد سے بدلنا ہوگا۔ عربوں کی حسرتناک شکست اور اسرائیل کی تاریخی فتح کے اسباب کی تلاش میں یہ اندازِ فکر پھر ہمیں غلط سمت کی طرف لے جا رہا ہے کہ اینگلو امریکن بلاک کی ناقابلِ تسخیر طاقتیں اسرائیل کی پشت پناہی میں تھیں اس لیے اسے فتح حاصل ہوئی اور ہمیں روس نے زبانی وعدوں پر رکھا اس لیے ہم شکست کھا گئے۔

حالات کا یہ تجزیہ شرمناک ہوتے ہوئے بھی اگر قابلِ قبول ہے تو اب ہمیں بغیر کسی جھجک کے یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ ”دریوزہ گری“ کا فن بھی ہمیں نہیں آتا۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اصل شکست اسی محاذ پر ہوئی ہے، میدانِ جنگ کی شکستیں بالکل ضمنی ہیں اس لیے کھویا ہوا وقار حاصل کرنے اور اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے کے لیے اب ہمارے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ پہلے اسی فن میں اپنے حریف کو شکست دینے کی کوشش کریں۔

لیکن ایک غیرت مند مومن جو اپنی تاریخ کی عظمتوں سے واقف ہے اور ایمان کی ناقابلِ تسخیر طاقتوں کا مزاج پہچانتا ہے، وہ ہرگز اس اندازِ فکر کو قبول نہیں کرے گا۔

یہ عقیدہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہماری فتح و کامرانی کا سررشتہ روئے زمین کی باطل قوتوں سے منسلک نہیں ہے بلکہ اس قادر و توانا خداوند کی لامحدود قدرت سے وابستہ ہے جس پر آج تک کوئی فتح حاصل نہیں کر سکا ہے۔

جب تک ہمارا ذہن تاریخ کے اس سانچے میں نہیں ڈھل جاتا جس کا آغاز میدان بدر سے ہوتا ہے اس وقت تک اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانا ہمارے لیے قطعاً ناممکن ہے۔ اسلام کی معنوی سرچشموں سے الگ رہ کر جینے کا انجام ہم نے دیکھ لیا اب ایک ثابت شدہ حقیقت کی آزمائش قطعاً فعل عبث ہے۔

اب تو بغیر رد و کد کے وہ منزل آگئی ہے کہ ساری دنیا کے مسلم سربراہان مملکت کھلے دل سے سر جوڑ کر بیٹھیں اور صحراؤں سے لے کر آبادیوں تک، زمین کے خشک حصوں سے لے کر سمندر کی تہوں تک جہاں جہاں بھی ہماری طاقتیں، علم و دانش کی صلاحیتیں، قوتوں کو فروغ دینے والی ذہانتیں رگوں میں خون فراہم کرنے والی دولتیں اور دماغ و روح کی توانائیاں بکھری پڑی ہیں، انہیں جلد سے جلد ایک مرکز پہ سمیٹ لیں اور اسلامی جذب و کشش کی بنیادوں پر باہمی اشتراک اور تعاون سے ایک نئے عالم اسلام کی تعمیر کا کام شروع کر دیں۔ اگرچہ ایسا ہوتا نظر نہیں آتا لیکن کہیں ہو گیا تو دنیا کی سب سے بڑی طاقت عالم وجود میں آجائے گی۔

ایک شبہ کا ازالہ:- اسرائیل کی غیر متوقع فتح سے بہت سے مسلمان اس خلعان کا شکار ہو گئے ہیں کہ مسلم افراد کا اپنے موقف سے ہٹ جانا اسلام پر کوئی الزام نہیں ہے، لیکن قرآن وحدیث کے فرمودات کا اپنی جگہ سے ٹل جانا قطعاً اس کی جوابدہی اسلام کے ذمہ ہے۔ یہودیوں کے متعلق کئی مقام پر اس امر کی صراحت موجود ہے کہ ذلت و رسوائی اور فلاکت و بد حالی قیامت تک کے لیے ان کے حق میں مقدر ہو چکی ہے۔ لیکن ان کی یہ شاندار فتح، یہ عالم گیر سرخروئی اور سیاسی اقتدار کا یہ استحکام کیا قرآن کی آیتوں سے کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟

اس انداز فکر کو ذہن کی مرعوبیت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ قیامت کی طویل مدت

اور دنیا کی پوری عمر کے مقابلے میں سو پچاس برس کا عرصہ قطعاً ایک لمحہ کے برابر ہے اور ظاہر ہے کہ ایک لمحے کی کوئی کیفیت بھی قطعاً شمار کے قابل نہیں ہوتی۔

واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہنوز یہودی ریاست کا وجود دنیا کے اکثر حصے کو تسلیم نہیں ہے۔ خود ہماری حکومت بھی جو قطعاً غیر اسلامی حکومت ہے اس کی موجودہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے سیاسی اقتدار کا یہ سارا نقشہ قطعاً عارضی اور عبوری ہے۔ بالکل ایسا ہی عبوری جیسے فٹ بال کے میدان میں کسی ٹیم کے زیادہ گول ہو جانے کے باوجود قطعی طور پر اسے جیتا ہوا نہیں کہا جاتا۔ ہار اور جیت کا آخری فیصلہ کھیل کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ ایسے بھی اتفاقات پیش آتے ہیں کہ عبوری دور کی جیتی ہوئی ٹیم وقت کے آخری نقطے پر ہار جاتی ہے اور ہاری ہوئی ٹیم اچانک خوشی میں جھومتی ہوئی میدان سے واپس لوٹی ہے۔

حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، مشیت یزدانی کا فیصلہ ابھی محفوظ ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ عربوں کی یہی شکست ان کی غیرت ایمانی کو جگا دے اور وہ قہر الہی کی بجلی بن کر کر یہودی ریاست کی خاکستر کو دریائے نیل میں ہمیشہ کے لیے غرقاب کر دیں۔ جتنی گہری نیند میں عرب کی جفاکش اور جانناز قوم سو گئی تھی اسے جگانے کے لیے اس سے کم درجہ کا کوئی زلزلہ کافی نہیں تھا۔

کفن چوروں کی انجمنیں:- ہمارے ملک میں چند ایسی جماعتیں ہیں جو کفن چوروں کی طرح موسمِ آلام کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جہاں کہیں فساد پھوٹا، کوئی آسمانی بلا نازل ہوئی، آناً فاناً ریلیف کی دکانیں کھل گئیں اور ماتم انگیز اپیلوں سے آبادیوں کی دیواریں رنگین ہو گئیں اور دیکھتے دیکھتے ملک کے طول و عرض سے لاکھوں روپے جمع ہو گئے، لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ روپے مصیبت زدوں تک پہنچے بھی یا نہیں؟ ابھی گزشتہ فسادات کے موقع پر ان جماعتوں کی شرمناک خیانتوں کا قصہ ایک عرصہ تک اخبارات اور پوسٹروں کی زینت بنا رہا۔ تبلیغی جماعت کے لیڈر مولوی منظور نعمانی اور جمعیۃ العلماء والوں پر کئی لاکھ غبن کے الزامات بار بار دہرائے گئے۔ جماعت اسلامی کا حشر بھی اپنی معاصر جماعتوں سے مختلف نہیں رہا ہے۔

بہر حال اسرائیل عرب جنگ کے نتیجے میں اب پھر ریلیف فنڈ کے لیے سازگار موسم آ گیا ہے۔ ہندوستان کی گلی گلی میں پوسٹروں، اپیلوں اور اشتہارات کی فصل اگ رہی ہے۔ جو لوگ اپنے شہر کے حقداروں تک ریلیف کی رقم نہیں پہنچا سکے، کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ سات سمندر پار جا کر وہ مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ تقسیم کریں گے۔

اس لیے جہاں تک فلسطین کے مہاجرین اور عرب مظلومین کے امداد کا سوال ہے، ہمیں نہایت فراخ دلی اور جگر سوزی کے ساتھ ان کی مدد کرنی چاہئے تاکہ عالمگیر اخوت اسلامی کا جذبہ فروغ پائے، لیکن مہتمم جماعتوں کا واسطہ بنانے کے بجائے ان کی امداد کا قابل اعتماد ذریعہ یہ ہے کہ براہ راست امدادی رقمیں نئی دہلی، متحدہ عرب جمہوریہ، شام اور اردن کے سفارت خانوں کو بھیج دی جائیں۔

مسلم اوقاف کے لیے خطرہ: آل انڈیائی سنی جمعیتہ العلماء ممبئی کے ناظم نشریات مولانا عاصم اشرفی نے مسلم اوقاف سے متعلق ایک سنگین خطرے کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے حکومت کا یہ اہم اعلان برائے اشاعت بھیجا ہے کہ اوقاف پر ناجائز قبضہ کے خلاف ۱۲ اگست ۱۹۶۷ء تک قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ یہ میعاد گزر جانے کے بعد جہاں بھی ناجائز قبضے ہیں انہیں جائز قرار دے دیا جائے گا۔

موصوف نے دفاعی کارروائیوں کے سلسلے میں جماعت کے ناظم عمومی حضرت مولانا ابوالوفا فصیحی کے اس مراسلے کی نقل بھی ارسال فرمائی ہے جو وزیراعظم حکومت ہند کو بھیجی گئی ہے اور جس میں نہایت نفرت کے ساتھ اس فیصلے کو واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔

وقت کی پہلی ضرورت ہے کہ مسلمانان ہند اپنے مذہبی اور تاریخی مفاد کے قتل عام کے خلاف سنی جمعیتہ العلماء کی آواز پر صف آرا ہو جائیں اور پروگرام حاصل کرنے کے لیے فوراً اس پتے پر رجوع کریں۔ مرکزی دفتر آل انڈیائی سنی جمعیتہ العلماء ۱۵ اپن روڈ، ممبئی۔

غیرت حق کو آواز: آج پہلی بار ان سنی مسلمانوں کو جو ناموس عشق رسول اور عقیدت اولیاء کی سرستوں میں شرا بور رہتے ہیں ایک اضطراب انگیز صورت حال کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری مذہبی روایات اور روحانی معتقدات کے خلاف باطل جماعتوں کی طرف

سے جو ہم چلائی جا رہی ہے وہ اب بالکل ننگی جارحیت پر اتر آئی ہے۔

ابھی حال ہی میں دیوبند کے مرکز سے اعلان ہوا ہے کہ جن مساجد میں یا محمد اور یا غوث الاعظم کے کتبے لگے ہوئے ہیں یا جہاں کے ائمہ اس طرح کے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں ان کی جماعتوں کا بائیکاٹ کیا جائے یا ماحول سازگار ہو تو اپنی الگ جماعت قائم کی جائے۔ جذبات میں مذہبی اشتعال پیدا کرنے کے لیے اپنے ہم عقیدہ افراد کو یہاں تک تلقین کی گئی ہے۔ ”ایسی مساجد میں جہاں کھلا شرک جاری ہو نماز پڑھنا غیرت توحید کے منافی ہے، اس سے بہتر ہے کہ گھر میں پڑھ لی جائے“۔ (ص: ۱۲، نئی جولائی ۶۷ء)۔

اس مہم کے پیچھے سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اہل سنت کے مذہبی مستقبل کو شدید نقصان پہنچایا جائے اور ان کے دینی روایات کو اتنا بھیانک اور داغدار بنادیا جائے کہ ماحول کے ذہن پر وہ بوجھل ہو جائیں۔ شروع شروع نجد کی تحریک بھی انہی مراحل سے گزری تھی، جب ہمنوا افراد کی ایک قابل اعتماد فوج اکٹھی ہو گئی تو اچانک تحریک نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا اور جو بات قلم کی نوک سے کہی جاتی تھی جب حالات سازگار ہو گئے تو ”بے نیام تلواروں“ سے کہی جانے لگی۔

مذہبی منافرت کی اس جنوں انگیز تحریک کا اختتام جس ہولناک انجام پر ہوا وہ حجاز مقدس کے کھنڈرات اور تاریخ کے اوراق سے بھی نمایاں ہے۔

اہل سنت کی مذہبی بے حسی کا یہ عالم رہا تو سن لیا جائے کہ اپنے یہاں بھی اسی طرح کا ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا ہے۔ اقتدار کی بیچارگی کے عالم میں آج جو لوگ زبان و قلم سے آگ برسا رہے ہیں کل اگر انہیں وسائل میسر آجائیں تو کیا داتا کی نگری، خواجہ کی چوکھٹ، قطب و نظام کی بستی اور کلیر و پاک پٹن کے آستانے ان کے دستبرد سے محفوظ رہ جائیں گے؟

اس لیے ضرورت ہے کہ اپنی مذہبی امنگوں کی سلامتی اور روحانی معتقدات کے تحفظ کے لیے بغیر کسی تاخیر کے وقت کا تقاضا محسوس کیا جائے اور جیسے بھی ممکن ہو فکر و احساس کی اجتماعی قوتوں کے ساتھ ماحول کو جارحیت کے زہر میں ڈوبنے سے بچایا جائے۔

وقت کا چیلنج: اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اب صرف آرزوؤں،

دعاؤں اور نیک تمناؤں سے کام نہیں چلے گا۔ تسلیوں اور خوش فہمیوں کا دور ختم ہو گیا اب تو اپنے مستقبل کو خطرے سے بچانے کے لیے دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے۔

اس امر میں قطعاً دورائے نہیں ہو سکتی کہ پریس کی طاقت کے محاذ پر ہم اپنے مذہبی حریفوں سے شکست کھا چکے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنے معاشرہ کے علمی حلقوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ زیادہ تر ناخواندہ عوام کی بھیڑ اپنے دین پسند مزاج کی برکت سے ہمارے ساتھ رہ گئی ہے، ویسے اب بھی ہم اکثریت میں ہیں، لیکن نظریات و معتقدات کے غلبے اور فکری قیادت کے لیے اس طرح کی بے جان اکثریت کچھ کام نہیں آتی، چنانچہ اپنی قائدانہ بیچارگی کا یہ تماشا کھلی آنکھوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے طول و عرض میں ہماری آواز کا تسلسل ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اپنی آواز کو یک لخت سارے ہندوستان میں پھیلا سکیں۔ اسٹیج پہ ضرور قابض ہیں لیکن اس کے زور و اثرات کو مثبت و قائم شکل میں تبدیل کرنے والی ہمارے پاس کوئی مشین نہیں ہے۔ لے دیکے ہماری جماعت کے چند ماہ نامے ہیں۔ وہ بھی مصائب کی گود میں سسکیاں لے رہے ہیں۔

اس شکوے کی ہمیں اجازت دی جائے کہ جام نور کلکتہ جس نے مذہبی صحافت میں ایک نئی راہ پیدا کی ہے اور حریفوں کے حلقے تک جس کی دھمک سے چونک گئے ہیں۔ صد حیف کہ وہ انہی حلقوں میں اب تک اجنبی ہے جن کے مذہب فکر کی وہ ترجمانی کرتا ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ رونما ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی دس کروڑ سنی آبادی میں دس ہزار بھی ہمیں ایسے افراد نہیں مل سکے ہیں جو قلم کے محاذ پر لڑنے والے اپنے ایک ”جانباز سپاہی“ کو خون کے چند قطرے فراہم کر سکیں؟ پانچ روپے کا سالانہ چندہ اس عظیم مفاد کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے جس کے نام پر اسلام کے جاں نثاروں نے اپنا سر بھی اتار کر دے دیا ہے؟ کیا ہمارے علماء، ہمارے مشائخ، ہمارے جماعتی کارکن اور ہمارے اخلاص پیشہ عوام اس فریاد پر توجہ فرمائیں گے؟

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، اگست ۱۹۶۷ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل

برصغیر ہند میں مسلمانوں کا مستقبل دن بدن جتنا بھیانک، مشکوک اور مایوس کن ہوتا جا رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ایک ثابت شدہ حقیقت کی طرح اب یہ بات بحث و دلیل کے مرحلے سے بہت آگے نکل چکی ہے کہ مسلمانوں کی ہر شام و سحر کسی بھی اچانک ٹوٹ پڑنے والے خطرے کے نشانے پر ہے۔

جو لوگ اس ملک کا نظام حکومت چلا رہے ہیں یا تو دیدہ و دانستہ وہ مسلمانوں کے مسائل سے چشم پوشی کرتے ہیں پھر تھک ہار کر ظلم و فساد کی طغیانوں کے آگے انہوں نے سپر ڈال دیا ہے، دونوں حالتوں میں سے کوئی حالت بھی ہو، نا اہلیت، سنگ دلی اور فرض ناشناسی کی انتہائی بدترین مثال ہے۔

موسم آلام:- موسم سرما، گرما اور برسات کی طرح اس ملک کا ایک اور موسم بھی ہے جسے ہم موسم آلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک پھوٹ پڑنے والی وبا کی طرح یہ موسم یہاں تقریباً ہر سال آتا ہے اور جب آتا ہے تو اچانک سینکڑوں آبادیاں صحراؤں اور قبرستانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں مہذب اور تعلیم یافتہ انسان آن کی آن میں درندوں کی سرشت اختیار کر لیتے ہیں۔

درد انگیز چیخوں، لرزہ خیز فریادوں اور آتش و خون کی طغیانوں سے فضا اس درجہ بوجھل ہو جاتی ہے کہ شرافت و انسانیت کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تڑپ تڑپ کر سرد ہو جانے والی لاشوں میں جوان بوڑھے، عورتوں اور معصوم بچوں کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ صرف مسلمان ہونے کا الزام زندگی کے سارے حقوق سے یک لخت محروم کر دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

تازہ واقعہ:- ابھی ابھی رانچی، سری نگر، شولا پور، مالگاؤں، احمد نگر، پونا، لہریا سرائے، ہزاری باغ اور سیٹامڑھی میں آگ اور خون کا یہ ہولناک موسم ہمارے سروں سے گزرا ہے، بعض بعض مقامات پر تو اب تک اس موسم کا محسوس سایہ سروں پر منڈلا رہا ہے۔ ہزاروں مکانات کروڑوں کی جائیدادیں، درجنوں عبادت خانے اور بے شمار جانیں تلف کر دینے کے بعد بھی آنکھوں میں خون کی سرخی اور ارادوں میں بہیمانہ تشنگی ہنوز باقی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب شام غربت ہمیں بیکسی کے آنسو لائے اور کہاں کہاں کھلے آسمان کے نیچے ہمیں مہاجرین کی زندگی گزارنی پڑے۔

ہمارا قصور:- ویسے بڑے سے بڑے قہر و ستم کے لیے بھی سند جواز تلاش کر لی جاتی ہے، اگر اس کے پیچھے ہيجان خیز اور اشتعال انگیز جرائم کے دستاویز موجود ہوں، لیکن وائے رے گردش ایام کی نیرنگی! کہ بھارت کے مسلمان صرف اپنی ناکردہ گناہی کی سزا پارہے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ آج تک انہوں نے اپنے وطن عزیز کے خلاف دشمن ملکوں کے ساتھ کسی طرح کی سازش نہیں کی۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ نشانے پر کون ہے۔ انہوں نے آگ برساتی ہوئی توپوں کے دہانے کھول دیے۔ انہوں نے ننگے مظالم اور کھلی ہوئی نا انصافیوں کے خلاف بیس سال کی مدت میں نہ کبھی جلوس نکالا، نہ احتجاجی مظاہرے کیے، نہ لائن کی پٹریاں اکھاڑیں، نہ ٹرینوں اور بسوں کو جلایا، نہ نظام حکومت میں تعطل پیدا کیا، نہ سرکاری املاک اور ارباب وطن کی جائیدادوں کو کوئی نقصان پہنچایا۔ ظلم و ستم کی آگ میں تپتے رہے لیکن ایک شریف، مہذب اور خیر پسند شہری کی طرح انہوں نے کبھی قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا۔

شر پسندی کی انتہا:- انصاف پسندوں کی دنیا حیرت کے ساتھ اس خبر کو سنے گی کہ ہمارے خلاف اشتعال پھیلا کر قاتلوں کا ہجوم اکٹھا کرنے کے لیے ستم پیشہ افراد کو جب ہمارا اپنا کوئی جرم نہیں ملتا تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے وہ ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جن سے فضا میں ہيجان برپا ہوا اور وہ انہیں ہماری طرف منسوب کر کے اپنے جوانوں کا خون گرم کر سکیں۔

مثال کے طور پر ابھی مہاراشٹر میں جہاں جہاں بھی مورتیوں کے ٹوٹے اور چوری ہونے کے سلسلے میں اشتعال پھیلا کر آگ اور خون کا ڈرامہ سلجھایا گیا ہے، وہاں جب غیر جانبدارانہ تحقیقات کی گئی تو اس امر کا انکشاف ہوا کہ خود ہندو فرقے کے لوگوں نے ان مورتیوں کو چرایا، توڑا اور ان کا چہرہ مسخ کیا تا کہ مسلمانوں کی طرف اسے منسوب کر کے فضا میں خون ریز اشتعال پھیلا یا جاسکے۔ چنانچہ روزنامہ ”آزاد ہند“ کلکتہ نے ۱۳ اکتوبر کی اشاعت میں روزنامہ ”انقلاب“ ممبئی کے حوالہ سے یہ خبر شائع کی ہے کہ احمد نگر کے ایک مندر میں مارکنڈے اور شنکر جی کی مورتیوں کو مسخ کرنے کے الزام میں تین ہندوؤں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ پونا میں رام پھمن کی مورتیوں کی صورت بگاڑنے کے الزام میں دو ہندو گرفتار کیے گئے ہیں۔ تعلقہ پنڈھر پور کے کوکنم نامی ایک گاؤں میں جین مندر سے پدماوتی دیوی کی مورتی غائب کرنے والا بھی ایک ہندو ہے۔ یہ سب کے سب تعزیرات ہند کی مختلف دفعات میں ماخوذ ہیں اور ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔

اب بتایا جائے کہ بھارت کے مسلمان کس پتھر سے اپنا سر پھوڑیں۔ وہ کچھ نہ بھی کریں جب بھی ان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ وہ جس طرح بھی رہیں بہر حال انہیں عذاب کی بھٹی میں سلگانا ہے۔

لائسنڈ آرڈر:- کہتے ہیں کہ ہندوستان پر ایک غیر مذہبی دستور کی حکومت ہے جو یہاں کے شہریوں کی جان و مال، عزت و ناموس اور مذہب و ملت کے تحفظ کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرتا ہے، لیکن محکمہ پولیس جس کے ہاتھ میں براہ راست حکومت کی ایجنسی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ فساد کے موقع پر وہ بھی اپنے آپ کو غیر جانبدار نہیں رکھ پاتا۔ پولیس کی سنگینیوں کے سائے میں جب غارت گروں کا مسلح ہجوم پوری آزادی کے ساتھ امن و قانون کی دھجیاں بکھیر چکنا ہے تو لاشوں کا انبار جمع کرنے کے لیے فوج طلب کی جاتی ہے۔

اس کے بعد آگ اور خون کی سرزمین پر معزز فرماں رواؤں، وزیروں اور لیڈروں کے قافلے اترتے ہیں، جو ٹھنڈی آہوں، مصنوعی ہمدردیوں اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مسلم آبادیوں کی خاکستر کا معائنہ فرماتے ہیں، مسجدوں اور مقبروں کے ٹوٹے ہوئے مینارے

دیکھتے ہیں، کراہتے ہوئے زخمیوں، لٹے ہوئے پناہ گزینوں اور آشفستہ حال یتیموں، بیواؤں اور مقتولوں کے پس ماندگان کے سامنے اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے ہیں جیسے واپس لوٹتے ہی وہ قاتلوں سے ایک ایک قطرہ خون کا انتقام لیں گے اور ان واقعات کے خلاف اتنا سنگین قدم اٹھائیں گے کہ پھر آئندہ اس طرح کے حادثوں کا اعادہ نہ ہو سکے گا۔

لیکن آزادی کے بعد تقریباً سات سو فرقہ وارانہ فسادات میں کہیں بھی اس طرح مثال نہیں ملتی کہ حکومت کے سربراہوں نے پولیس افسروں، علاقائی انتظامیہ اور حکام ضلع کے خلاف کوئی بھی سخت اور عبرتناک نوٹس لی ہو۔ اپنے فرائض منصبی سے مجرمانہ چشم پوشی کرنے کی تعزیر میں انہیں معزول کر دیا ہو یا کم از کم معطل ہی کیا ہو اور بدامنی پھیلانے کے جرم میں قاتلوں اور بلوائیوں کو قرار واقعی سزا دی ہو۔ صرف پند و نصیحت اور بیانات سے اگر جرائم پیشہ راہ راست پر آجاتے تو تعزیرات ہند کے نام سے ایک مجموعہ قوانین کی ہرگز ضرورت پیش نہ آتی۔

ہمیں کہنے دیا جائے کہ مبہم الفاظ میں فسادات کی مذمت اور مظلومین کے ساتھ زبانی ہمدردی کے علاوہ آج تک مسلمانوں کی جان و مال اور مذہب و ناموس کے تحفظ کے لیے کوئی آئینی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے اور یہ اتنی شرمناک اور سنگین فروگزاشت ہے جسے آنے والا مورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ طاقت کے بل پر اس سے بھی زیادہ لرزہ خیز مظالم ڈھائے جاسکتے ہیں، لیکن طاقت کے بل پر تاریخ کا بے لاگ فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا۔

آستین کے سانپ:- ہماری درناک زندگی کا ایک شرمناک سانحہ یہ بھی ہے کہ بدقسمتی سے خود ہمارے ہی اندر کچھ ایسے غدار قسم کے لوگ ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ فسادات کے موقع پر یہ لوگ حکومت کی فروگزاشتوں کو بے نقاب کرنے کے بجائے، انتظامیہ کے مرکزی افراد کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔

۶۷ء کے جنرل الیکشن سے قبل کانگریسی دور وزارت میں یہ فرض جمعیۃ العلما انجام دیا کرتی تھی۔ چنانچہ کلکتہ ۶۴ء کے فساد کے موقع پر جب آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ کے ایک وفد نے جو مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی، مولانا سید شاہ اسرار الحق صاحب اور راقم

الحروف پر مشتمل تھا، سابق وزیر داخلہ مسٹر نندا کو ایک عرضداشت پیش کی تھی جس میں صوبائی حکومت کی فروگزاشتوں اور مجرمانہ کوتاہیوں کا نہایت مدلل اور واضح لفظوں میں نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وفد کے ممبران کو مغربی بنگال کی حدود سے بغیر کسی مہلت کے شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

اخبارات کے ذریعہ کلکتہ کے مظلوم مسلمانوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہیں انتہائی قلق ہوا کہ نہایت نازک موقع پر وہ اپنے چند مخلص اور غمگسار خادموں کی رفاقت سے جبراً محروم کر دیے گئے، لیکن شرم و غیرت سے خود دار مسلمانوں کی گردنیں جھک گئیں جب دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جمعیۃ العلما کے ملت فروش لیڈروں نے مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ اور صوبہ کے کلیدی حکام کی کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں شاہانہ دعوت کی جس میں ملت مظلوم کی غارتگری پر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔

انہی سرکاری نیاز مندوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی نو مہینے اور راقم الحروف آٹھ مہینے تک یوپی اور بہار کے مختلف جیلوں میں نظر بند رہے۔

نیاز مندوں کا نیا دستہ:- اب جب کہ تازہ انتخاب کے بعد کئی صوبوں میں سیاسی اقتدار کے ڈھانچے بدل گئے ہیں، جمعیۃ العلما کے سرکاری اثر و رسوخ کی دوکان ان صوبوں میں ویران ہو گئی ہے اور اس مسند پر اب وہ لوگ قابض ہیں جنہوں نے نئی حکومت کو برسر اقتدار لانے کے لیے اپنی قوم کا سودا کیا ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے بہار میں مرحوم غلام سرور صاحب ایڈیٹر ”سنگم“ پٹنہ مسلم عوام کے بہت بے باک لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ۶۴ء کے فسادات کے موقع پر انہوں نے اڑیسہ اور بہار کی کانگریسی حکومتوں کے خلاف زبان و قلم کے نشتر سے ایک طوفان برپا کر دیا تھا اور اسی طوفانی موسم میں انہوں نے ”شیر بہار“ کا وہ تاریخی اعزاز حاصل کیا جس کے صدقے میں وہ موجودہ حکومت کا ”پایہ تخت“ بنے ہوئے ہیں۔

لیکن اب ذرا ”بندہ مومن“ اور ”بندہ زر“ کا فرق ملاحظہ فرمائیے کہ وہی غلام سرور صاحب جو کانگریسی دور حکومت میں درجہ سنگد سے نصاب تعلیم سے متعلق ایک ہندی کتاب کی

اشاعت پر جس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر شائع کی گئی تھی..... چیخ اٹھے تھے۔ چنانچہ صوبے کے اخبارات، مسلم جماعتوں اور عوام کے ہمہ گیر احتجاج پر وہ کتاب ضبط کر لی گئی اور ریاستی حکومت کی طرف سے مصنف، پرنٹر اور پبلشر پر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر اب یہ عبرتناک کہانی سنئے کہ جب حالیہ الیکشن میں کانگریس کا تختہ الٹ گیا اور متحدہ محاذ کی حکومت برسر اقتدار آئی تو اچانک اس کتاب کی ضبطی کا آرڈر واپس لے لیا گیا، ملزمین پر سے مقدمہ بھی اٹھا لیا گیا اور اب الٹے ان لوگوں پر مقدمہ چل رہا ہے جو اس کتاب کے خلاف احتجاج کرنے میں پیش پیش تھے۔

یہ سب کچھ اس حکومت میں ہوا جسے برسر اقتدار لانے میں غلام سرور صاحب نے ایک ”اسلامی مجاہد“ کا رول ادا کیا تھا۔ وہ دل آزار کتاب مارکیٹ میں بھی آگئی، اصل ملزمین بھی چھوٹ گئے اور فریاد کرنے والے عذاب کی بھٹی میں سلگ رہے ہیں، لیکن غلام سرور صاحب بت بنے خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں، اب قومی غیرت کا وہ سارا خروش دریائے لنگا کی لہروں میں دفن ہو کے رہ گیا۔

سرکار پرستی کے جذبہ مذموم کی ایک اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز کہانی سنئے:

ٹھیک اس وقت جب کہ رانچی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، غلام سرور صاحب اپنے سرکاروں کے ساتھ شہروں کے سرکٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ ان کی ویران پلکوں کے سایے میں وہ سب کچھ ہوا جس کا ماتم ہمیں عمر بھر کرنا ہوگا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب سوائے حسرت ناشکیب کے اور کیا ہے؟ لیکن وقت کا یہ ابھرا ہوا سوال دبایا نہیں جاسکتا کہ کیا غلام سرور صاحب نے اس بار بھی اسی تیور میں حکومت بہار کو لالکا رہے جس تیور کے ساتھ انہوں نے ۶۴ء کے فساد میں کانگریسی حکومت کے بچے ادھیڑے تھے۔ لاکارنا تو بڑی بات ہے وزارت کی کابینہ کی وہ فرقہ پرست پارٹی جس کی ننگی جارحیت ہر رخ سے بے نقاب ہو چکی ہے اور جن کے دونوں ہاتھ مبینہ طور پر رانچی کے قتل عام میں رنگین ہیں وہ اب بھی غلام سرور صاحب کی پسندیدہ حکومت کی ناک کا بال ہے۔

اور یہ خبر پڑھتے ہوئے شاید پسینہ نکل آئے گا کہ فساد کے بعد، جب کہ مسلمانوں میں

انتہائی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا، فرقہ پرستوں نے یہ خبر اڑادی کہ رانچی کے فساد میں پاکستان نے مسلمانوں کو ہتھیار سپلائی کیے ہیں۔ چنانچہ اس ہيجان خیز پروپیگنڈے کے نتیجے میں مسلمانوں کی خانہ تلاشیاں شروع ہو گئیں۔

یہاں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ خانہ تلاشیوں کے موقع پر پولیس کا رویہ کس درجہ دہشت خیز اور ظالمانہ ہوتا ہے، ۲۷ اگست کے ”سگم“ اخبار میں خانہ تلاشیوں کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کا متن یہ ہے:

”ایک اخباری نمائندے نے جب مسٹر سٹونی (چیف سکریٹری حکومت بہار) سے پوچھا کہ رانچی میں پولیس نے جن اسلحوں کو اپنے قبضے میں لیا ہے ان میں چھوٹے چھوٹے بم بھاری تعداد میں ملے ہیں، ان پر پاکستان کے نشان تھے۔ اس پر مسٹر سٹونی نے کہا کہ اس طرح کے جتنے اسلحہ جات حاصل کیے گئے ہیں، وہ سب مال خانے میں جمع ہیں اور تحقیقات کی جارہی ہے۔ یہ دستی گولے کسی فیکٹری کے تیار شدہ ہیں یا ہاتھ سے بنائے گئے ہیں ابھی کہنا مشکل ہے، چونکہ اس کی جانچ ابھی کی جارہی ہے۔“

اب اسی رپورٹ کے پس منظر میں دوسرے صفحے پر غلام سرور صاحب کا یہ خطرناک ادارہ ملاحظہ فرمائیں:

”تازہ ترین انکشاف ہوا ہے کہ پاکستان کے اسلحہ ساز کارخانوں میں ایسے اسلحے بھی تیار کیے جا رہے ہیں جن پر کوئی نشان نہیں ہوتے۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ان اسلحوں کو تخریب کاری کی کارروائیوں کے لیے ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں اسمگل کیا جائے۔“ ایک مشکوک، بے اعتماد اور مشتعل ماحول میں غلام سرور صاحب نے جس تازہ ترین انکشاف کا اظہار فرمایا ہے، کیا اس کا واضح مطلب یہ نہیں کہ شہادت کو یقین سے بدلنے کے لیے مشکوک ذہنوں کو تقویت پہنچائی جائے اور ہوا پراڑنے والوں کو بروقت اس طرح کا ہتھیار دیا جائے کہ نہ بھی کسی ہتھیار پر پاکستانی فیکٹری کا نشان موجود ہو جب بھی اسے آسانی سے پاکستان کی طرف منسوب کیا جاسکے۔

آج تو نہیں، لیکن جی حضوری کا سرور اتر جانے کے بعد اپنی اس شرمناک حرکت پر غلام

سرور صاحب بھی غور فرمائیں گے تو ان کا ضمیر انہیں ضرور ملامت کرے گا۔ خدائے قدیر اس طرح کے خود فروش رہنماؤں کے شر سے ملت مظلوم کو محفوظ رکھے۔

مظلومین رانچی کے مطالبات: - ۹ ستمبر ۶۷ء کو جب کہ شریعتی اندرا گاندھی وزیراعظم حکومت ہند رانچی کے دورہ پر آئی تھیں تو ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن فیکٹری کے مسلم ملازمین نے اپنے رفیوجی کیمپ میں انہیں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔

چنانچہ جب میں ستمبر کے درمیانی ہفتے میں رانچی کا دورہ کرنے گیا تو مسلم ملازمین کی انجمن کے سربراہوں نے ان لرزہ خیز واقعات کی تفصیل بتائی جنہیں سن کر روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں مسٹرز بیرری اور تقسیم عالم صاحب نے اس میمورنڈم کی ایک نقل بھی مرحمت فرمائی۔ اپنی عرضداشت میں مسلم ملازمین نے نقصانات کی تلافی اور اپنے مستقبل کے تحفظ کے لیے جو معقول مطالبات وزیراعظم کے سامنے پیش کیے تھے اس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے، تاکہ عام لوگوں کو اس کے پس منظر کا اندازہ ہو سکے اور جمہوری سطح پر ان معقول مطالبات کی حمایت کی جائے۔

مطالبات: - (۱) کسی ہائی کورٹ جج کے ذریعہ اس پورے سانحہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے جو ایچ۔ ای۔ سی کالونی میں پیش آیا اور وہ مجرمین جنہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس میں حصہ لیا انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۲) ایچ۔ ای۔ سی کالونی میں مسلم ملازمین کی رہائش کے لیے ایک خاص پاکٹ بنایا جائے۔ اس پاکٹ کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ اکثریتی فرقے کے کواٹروں سے بالکل کٹ نہ جائے۔ واضح رہے کہ ہمارا یہ مطالبہ علیحدگی پسندی کے جذبے کے تحت نہیں ہے، بلکہ صرف یہ خیال مد نظر ہے کہ اگر آئندہ پھر اس طرح کا کوئی واقعہ رونما ہوا تو منتظمین کو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنے میں آسانی ہو۔

چنانچہ ۶۴ء کے فسادات کے بعد راور کیلا فیکٹری کے مسلم ملازمین کی رہائش کا ایسا ہی انتظام کیا گیا ہے اور اب وہ پہلے سے زیادہ محفوظ ہیں۔

(۳) جو مسلم ملازمین فساد میں شہید ہوئے ہیں ان کی جگہ پر ان کے کسی وارث کو فوراً

ملازمت دی جائے تاکہ ان کی فیملی کی پرورش ہو سکے اور اگر ورثانہ ملیں تو ان کی خالی جگہیں صرف مسلمانوں سے پر کی جائیں۔

(۴) کسی بھی اطمینان بخش ذریعہ سے مستقل طور پر ہماری حفاظت کی جائے۔ بالخصوص جب ہم اپنی ڈیوٹی پر ہیں تو ہماری فیملی کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۵) جن لوگوں کا جانی و مالی نقصان ہوا ہے انہیں معقول معاوضہ دیا جائے۔

(۶) امن سوز، شریک اور بد معاشوں کو اس کالونی میں رہنے یا داخل ہونے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ عام حالات اور کوششوں کے نتائج سے باخبر ہونے کے لیے اس پتے پر ایچ۔ ای۔ سی کالونی کے مسلم ملازمین سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مسٹرز بیرری، روم ۴۵، ریلیف کیمپ، دھروا، رانچی۔

اردو زبان کا مسئلہ: - اردو زبان کے ساتھ مسلسل بے انصافیوں نے ہمارے جذبات کو اس قدر مجروح کر دیا ہے کہ اب رستا ہوا زخم نمائشی تقریروں سے منہ دل نہیں ہو سکتا۔ یوپی اور بہار کی متحدہ محاذ حکومتوں نے عام انتخابات کے موقع پر اردو کے بارے میں جو وعدے کیے تھے اور انہی وعدوں کے نتیجے میں انہیں اردو دوستوں کے ووٹ حاصل ہوئے، لیکن افسوس کہ ان کے مستحکم وعدے نقش بر آب سے زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوئے۔

یوپی کی حکومت نے تو ہمہ گیر مظاہروں، مشترکہ احتجاجوں اور جمہور کی مسلسل بے چینیوں اور قربانیوں کے باوجود علاقائی زبان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اور بہار کا کیا کہنا! یہاں تو قتل عام ہی اس لیے کرایا گیا ہے کہ اردو کا نام لیتے ہوئے خواب میں بھی لوگ چونک اٹھیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اردو کے مجاہدین آخر پتھر کے بتوں سے کب تک لڑتے، ایک نہ ایک دن انصاف و جمہوریت کی اس تحریک کا جنازہ نکلتا ہی تھا، نکل گیا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کی کسی بھی سیاسی پارٹی کا ذہن اردو کے حق میں قطعاً صاف نہیں ہے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، نومبر ۱۹۶۷ء)

جام نور کا دوسرا سال

فروری ۱۹۶۷ء میں جام نور کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ آج اس کا دوسرا سال شروع ہو رہا ہے، گزری ہوئی مدت پر غور کرتا ہوں تو حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ طبیعت جب آلام کی خوگر ہو جاتی ہے تو مصائب کے پہاڑ بھی تنکے سے زیادہ وسیع نہیں معلوم ہوتے۔ اہل سنت کے ایک ترجمان کو زندہ رکھنے کے لیے جن حوصلہ شکن مشکلات سے ہمیں گزرنا پڑا۔ یہ ہماری زندگی کی ایک نہایت دردناک کہانی ہے۔ ذکر اس کا نہیں ہے کہ امید و بیم کے تلاطم میں بلاخیز موجوں نے ہماری مزاحمت کی، بلکہ جس یاد کی تلخی میں بار بار آنکھوں سے لہو پٹکا وہ یہ ہے کہ ساحل کی خاموش سطح بھی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ صبر و تحمل کے ساتھ اس نشتر کی اجازت دی جائے کہ عاشقان رسول کی وہ معزز جماعت جس کی آنکھ کے آنسو یا دجاناں میں چشمہ کوثر کی طرح رواں دواں رہتے ہیں، اس نے بھی اپنے ایک جنگجو سپاہی کو جو ناموس رسول کے محاذ پر دشمنوں سے دفاعی جنگ لڑ رہا تھا یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔ پیشانی پر شکن ڈالے بغیر ہماری ملت طیبہ کے مقتدر رہنما ایک آزر دہ التفات کا یہ شکوہ سن لیں کہ انہوں نے اپنی جوان نسل کے مستقبل کی طرف سے جس فراغت کے ساتھ آنکھیں بند کر لی ہیں اس کا انجام ہم دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ جن کے لبوں کی ایک جنبش سے زندگی کا دھارا پھوٹ سکتا تھا، صدحیف کہ ان کی پلکوں کے سایے میں کتنے ہی غم نصیبوں نے صرف اس لیے جان دے دی کہ دم والہیں تک انہیں آب حیات کا ایک قطرہ نہیں مل سکا۔

ہماری ناخلیب حسرتوں کا مدفن:- سنی دنیا میں کتنے ہی روزنامے، ہفتہ وار اور

ماہنامے صحافت کے آفاق پر خورشید بن کر چمکے اور غروب ہو گئے۔ بعض کی موت کا غم تو مرگ جواں سال کے صدمے سے کم نہیں تھا۔ ہماری ملت کے عشاق ان بے گور و کفن میتوں پر دو آنسو بہا کر تعزیت کا حق تو کیا ادا کرتے کہ تجہیز و تکفین کی رسم میں شرکت کے روادار نہیں ہوئے۔ میں بھی ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ غالباً یہ خودکشی کی موت ہوگی، جہی لوگوں کو اپنے تئیں ایک کراہت محسوس ہو رہی ہے، لیکن جس دن میں نے ایک اضطراب مسلسل سے اپنی زندگی کا پیمان و فاباندھا اور جام نور کے نام سے ایک نئے ماہنامے کا آغاز کیا۔ اس دن میری جواں سال امنگوں کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ میں اس خوش فہمی کی جنت میں محو خرام شوق تھا کہ ہندوستان میں مذہبی جاں نثاریوں کی کیا کمی ہے؟ اہل سنت کے جو افراد میلاد و فاتحہ اور بزرگوں کے مزارات کی حاضری پر ہر سال سینکڑوں روپے قلب و روح کی پوری بشارت کے ساتھ نچھاور کر دیتے ہیں، اپنے مشرب کی ان روایت کے خلاف حملہ آوروں کے دفاع پر کیا وہ پانچ روپے سالانہ بھی نہیں قربان کر سکیں گے؟

مذہبی اجتماعات اور نجی ملاقاتوں میں مخالفین کے پریس اور ان کی ایمان سوز تحریروں کے خلاف جن حضرات کی گفتگو میں اڑتی ہوئی چنگاری کا غیظ میں نے محسوس کیا تھا بھلا کیوں نہ اس خوش فہمی کا شکار ہوتا کہ حق کے دفاع کے لیے قلم کے محاذ پر جو دیوانہ بھی کھڑا ہو جائے گا، پانچ کروڑ اہل سنت کی مضطرب روحمیں ایک آواز پر اس کے گرد جمع ہو جائیں گی۔

لیکن وائے رے بخت زبوں کی آشفٹہ حالی! نالہ غم سے پتھروں کے جگر میں شگاف پڑ گئے، لیکن اہل ایمان کے دھڑکتے ہوئے دلوں میں کوئی رقت تک پیدا نہیں ہوئی۔ سوائے چند نمگسار ہمدردوں کے کسی نے آج تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ جام نور کے صفحات کی آرائش کے لیے وہ روشنائی کہاں سے آتی ہے جس میں نامراد یوں کی سیاہی سے زیادہ خون جگر کی سرخی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مشکلات کے ہجوم میں کسی مہینے چند دن کی تاخیر ہوئی یا ڈاک والوں کی غفلت سے رسالہ نہیں پہنچا تو دوسرے ہی دن قہر و غیظ میں ڈوبا ہوا ایک تعزیر نامہ تشریف لایا۔ تحریر کا تعلق رسالہ کی یاد دہانی تک محدود ہوتا تو کچھ مضائقہ نہیں تھا۔ اہل سنت کے زوال کی پوری داستان قلمبند کر دی گئی اور وہ بھی اس انداز میں کہ

گویا سارے زوال اور پراگندگیوں کے ہم تنہا ذمہ دار ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہمیشہ ہم نے معذرت کی ہے کہ جماعت کے جو قابل رحم کارکن آپ کے پر خلوص تعاون کے مستحق ہیں، درشت لب و لہجہ اختیار کر کے ان کے دل کا آگینہ نہ توڑے۔

مذہبی زندگی کی ضروریات:- اب جب کہ ”جام نور“ دوسرے سال کے نقطہ آغاز میں داخل ہو رہا ہے، میں ملت کے عوام و خواص سب کی بارگاہوں میں ایک فریادی کی طرح آواز دے رہا ہوں کہ درس گاہوں کی بنیادی ضرورت مسلم! وعظ کے اسٹیج کی افادیت سے انکار نہیں، عرس و فاتحہ کے ذریعہ روحانی کیف و گداز کی احتیاج بھی تسلیم! لیکن پریس کی طرف سے بے اعتنائی کسی طرح بھی قرین مصلحت نہیں ہوگی۔ پانچ کروڑ افراد کا جو سودا اعظم چند ماہناموں کا بار نہیں اٹھا سکا اس سے کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہفتہ وار اور روزناموں کے لیے خون فراہم کر سکے گا۔

آج تک میں نے جام نور کے لیے کوئی ہنگامہ خیز اپیل نہیں کی ہے، حوادث کی کتنی ہی تلخیوں کو میں نے پلکوں میں جذب کر لیا ہے، لیکن زبان و قلم پر کوئی حرف شکایت نہیں آنے دیا۔ اب جبکہ قوت شکیبائی مشکلات کے پیہم پیہموں سے مضحمل ہوتی جا رہی ہے اور مایوسیوں کا اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، میں اپنے معزز خریداروں سے خصوصاً اور اہل سنت کے ان افراد سے جو دل پر سوز کی بے چینیوں سے واقف ہیں عموماً اپیل کرتا ہوں کہ دینی اخلاص کے نام پر جام نور کی توسیع و اشاعت کے لیے اپنے وقت کی تھوڑی قربانی پیش کریں۔ دودو خریدار بھی ہر شخص نے فراہم کر دیے تو میں اس بحران سے نکل جاؤں گا جس سے اس وقت اچانک دوچار ہو گیا ہوں۔ آئندہ شمارے میں ہم اپنے بزرگوں اور نغمہ ساز دوستوں کا بالتفصیل تذکرہ کریں گے، جنہوں نے جام نور کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے اپنی گراں قدر توجہات سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ ربیع الاول شریف تک جام نور کی خریداری قبول کرنے والوں کو چونکہ تین روپے کا ”خورشید رسالت نمبر“ مفت پیش کیا جائے گا، اس لیے ربیع الاول تک جو لوگ خریداری قبول فرمائیں گے ان سے چھ روپے لیے جائیں گے، تاکہ ادارے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، جنوری ۱۹۶۸ء)

ہندوستان میں مسلم قیادت کا تنقیدی جائزہ

آج ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان جس سنگین مرحلے سے گزر رہے ہیں، تاریخ میں ایسے مواقع بہت کم آئے تھے۔ ماتم حسرت ناک پامالیوں کا نہیں، اس غم نصیبی کا ہے کہ ٹھوکروں کی لگاتار اذیت کے بعد بھی اسلامیان ہند کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ خوش فہمی اور سادہ لوحی نے انہیں اتنا بے حس بنا دیا ہے کہ وقت کا جو شاطر بھی اٹھتا ہے آسانی سے ان کی متاع عقل و ہوش کا شکار کر لیتا ہے۔ غلطی سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی بھی کارواں کے ساتھ چلنا چاہیے، حالانکہ چلنا بذات خود کوئی مفید کام نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات بیٹھے رہنے سے زیادہ مضر رساں ہے۔ منزل مقصود کی مخالف سمت پر جتنی تیزی کے ساتھ جو چلے گا اسی رفتار سے وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جائے گا۔

ہندوستان کی آزادی کو اکیس سال ہو گئے، اس درمیان میں اجتماعی زندگی کی سطح پر بہت سی قیادتوں نے جنم لیا، نعروں کے بل پر قافلہ تیار ہونے میں دیر نہیں لگی، دیکھتے دیکھتے شاہراہوں پہ کارواں کی گرداڑ نے لگی، قافلہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ایک منزل پر پہنچ کر کبھر گیا، کچھ پلٹ کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ کارواں کے ساتھ چلنے والے منزل مقصود سے بہت دور نکل آئے، وہ جگہ پھر بھی قریب جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

پامالیوں کی ایک مثال:- پچھلے دنوں جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، جمعیتہ العلماء اور مسلم لیگ کے گٹھ جوڑ سے مجلس مشاورت نام کی ایک نئی جماعت منظر عام پر آئی۔ شروع شروع ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کے سارے مسائل اب چشم زدن میں حل ہو جائیں گے۔ فرقہ وارانہ فسادات، اردو زبان اور مسلم یونیورسٹی سے لے کر تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی

مسائل تک اب کوئی مسئلہ تشہد التفات نہیں رہے گا، لیکن الیکشن کا موسم آتے ہی چہروں سے نقاب اٹھنے لگی اور دل کی چھپی ہوئی بات آہستہ آہستہ زبان پر آنے لگی اور جس دن نو نکاتی انتخابی منشور منظر عام پر آیا، اس دن بیچ چوراہے پر مجلس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ راز پوری طرح بے نقاب ہو گیا کہ ”تنظیم نو“ کا مقصد فلاح مسلمین نہیں تھا، بلکہ الیکشن کے موسم میں مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت وصول کرنے کے لیے زمین ہموار کرنی تھی۔

خدمات کا جائزہ:۔ مجلس مشاورت نے اپنی تین سال کی مدت رہنمائی میں مسلمانوں کی کیا خدمات انجام دی ہیں اور ان کے کتنے مسائل حل کیے ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک تاریخی جائزہ ملاحظہ فرمائیے:

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ:۔ سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ لے لیجیے، کیونکہ اسی مسئلہ کو جذباتی ہیجان کی مدد سے مجلس مشاورت نے اپنے فروغ کا ذریعہ بنایا۔ ۱۵ جولائی کے یوم دعا سے لے کر لکھنؤ کے اولڈ بوائز کنونشن تک اور پھر لکھنؤ سے لے کر دہلی کے سپریم کورٹ تک دو لفظوں میں مجلس مشاورت کی فرخندہ فال قیادت کی سرگزشت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی آئینی سطح پر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ وہ مسلم فرقے کا کوئی مخصوص ادارہ نہیں ہے۔ اس لیے اب مسلم کردار کے تحفظ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مجلس مشاورت کو مبارک ہو کہ مسلمانوں کے ایک مذہبی ادارے کی صد سالہ تاریخ کو اس کی چند سالہ قیادت نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے میں مجلس مشاورت کی قیادت نے ہمیں کیا دیا؟

ناکامی..... محرومی..... پامالی!!!

اردو زبان کا مسئلہ:۔ یہ سہرا بھی مجلس مشاورت ہی کے سر ہے کہ یوپی اور بہار سے اردو کا مکمل طور پر دیس نکالا ہو گیا۔ بہار میں تو اردو کے نام پر اتنا بھیا تک فساد پھوٹ پڑا کہ اب مشکل ہی سے وہاں کوئی اردو کا نام لے گا۔ یہ الزام مجلس مشاورت کے سر ہے بنیاد نہیں ہے کیوں کہ جنرل الیکشن کے موقع پر مجلس مشاورت نے جس نو نکاتی منشور پر سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اس میں اردو زبان کا مسئلہ سر فہرست تھا۔ اس کے

بعد مجلس کی جدوجہد یا حسن اتفاق سے کچھ بھی کہہ لیجیے، بہر حال یوپی اور بہار میں کانگریس کی حکومت الٹ گئی اور وہ لوگ برسر اقتدار آ گئے جنہیں کامیاب بنانے کے لیے مجلس مشاورت نے مسلمانوں کو ”بندہ بے دام“ کے طور پر استعمال کیا تھا، لیکن گمراہ کن قیادت کی یہ شرمناک سازش کبھی فراموش نہیں کی جائے گی کہ پوری ملت کو قدموں پر نثار کر دینے کے بعد بھی مجلس مشاورت اپنی پسندیدہ حکومتوں کے عتاب سے اردو زبان کو نہیں بچا سکی۔ اردو زبان کے مسئلے میں مجلس مشاورت کی قیادت نے ہمیں کیا دیا؟

ناکامی..... پامالی..... یقینی..... بیوگی!!!

سب سے شاندار خدمت:۔ مجلس مشاورت کی سب سے شاندار خدمت یہ ہے کہ الیکشن کے موقع پر چھ کروڑ مسلم ووٹروں کی قیمت وصول کرنے کا جب سوال پیدا ہوا تو جہاندیدہ لیڈروں نے سوچا کہ کانگریس بدنام ہو چکی ہے، کھل کر اس سے سودا طے کرنے میں پگڑی سلامت نہیں رہ سکے گی۔ اس لیے مارکیٹ میں نئے خریداروں کی تلاش شروع ہوئی، بالآخر کانگریس کی حریف پارٹیوں سے معاملہ طے ہو گیا اور اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سارے ہندوستان میں کانگریس کو ہرانے کی ایک طوفانی مہم شروع کی گئی، لیکن نشانے کی یہ خطا کبھی معاف نہیں کی جائے گی کہ ”کانگریس ہراؤ مہم“ کے پیٹ سے جن سنگھی اقتدار کا بچہ نکل آیا اور نکلتے ہی وہ جوان ہو گیا اور حکومت کی گدی پر قبضہ کر لیا۔

جو مسلم آزار درندے خواب میں بھی وزارت کی بات نہیں سوچ سکتے تھے وہ مجلس مشاورت کی مہربانیوں سے وزارتی کابینہ پر مسلط ہو گئے۔ اب کفر کا جتنا حوصلہ بھی بلند ہو اور مسلمانوں کی پامالی کا جو نقشہ بھی ملک کے طول و عرض میں تیار کیا جائے کم ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مسائل میں مجلس مشاورت کی قیادت نے ہمیں کیا دیا؟

اضطراب مسلسل..... شکست پیہم..... لگا تار پامالی!!!

آخری امید گاہ:۔ ملک میں اب کوئی ایسی مسلم جماعت نہیں ہے جس کی قیادت کا تجربہ مسلمانوں نے نہ کر لیا ہو۔ فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر بھی سب کی تصویریں سامنے آ گئیں۔ کہیں بھی اخلاص و دیانت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، ہر جگہ ضمیر کی آواز کا فقدان ہے

اور سن لیا جائے کہ تنہا مجلس مشاورت کی گمراہ کن قیادت کا تجربہ ان تمام جماعتوں کی ناکامی اور غلط اندیشی کی ایک کھلی ہوئی دستاویز ہے، جن کے مجموعے کا نام مجلس مشاورت ہے اور جس کے اقبال کا چڑھتا ہوا سورج ڈوب چکا ہے۔

اب لے دے کے ہندوستان کے طول و عرض میں اہل سنت کے وہ نیک نام قائدین ہیں جن کا ماضی شفاف آئینے کی طرح بالکل بے داغ ہے، جنہوں نے مسلمانوں کے مسائل میں اسلام کے باہر کی قوتوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا ہے۔ وہ اس عقیدے پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے ہیں کہ باعزت زندگی بھیک میں نہیں ملا کرتی، اپنے مستقبل کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کو خود اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اسلامیان ہند کی تاریخ میں علمائے اہل سنت کی اجتماعی زندگی کا یہ رخ بہت نمایاں رہا ہے کہ انہوں نے سستی شہرت اور سیاسی مفاد کے لیے ہنگامہ خیز تحریکوں کا طوفان اٹھا کر کبھی بھی مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ہر طرف سے پامال ہو کر اب مسلمانوں کی غالب اکثریت علمائے اہل سنت کی صحت مند قیادت کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

بہار صوبائی سنی کانفرنس: چنانچہ اضلاع چھپرہ، دیواریا اور چمپارن کے مسلمانوں بالخصوص علی گنج سیوان کے بلند ہمت عمائدین نے ممی کے مہینے میں ”کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی“ کے زیر اہتمام ریاستی پیمانے پر ایک فقید المثل کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کے سرپرست حضور مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم اور صدر اعلیٰ، حضرت برہان المملۃ علامہ الحاج مفتی برہان الحق صاحب قبلہ جیلپوری دامت برکاتہم سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کر لیا گیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس کانفرنس میں صوبے کے ایک لاکھ مسلمان شرکت کریں گے اور اہل سنت کے تقریباً دو سو مشاہیر علماء و مشائخ سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور عشق و اخلاص کے ساتھ کتاب و سنت کے مقرر کردہ خطوط پر مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود کے لیے ایک موثر، بے ضرر اور مفید لائحہ عمل مرتب کریں گے۔ کانفرنس کے سلسلے میں ان بچوں پر معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ (۱) حضرت مولانا انیس عالم صاحب ناظم مجلس استقبالیہ دارالعلوم حیدریہ معینیہ، نیا قلعہ، سیوان، ضلع ساران (۲) ارشد القادری، صدر مجلس استقبالیہ، فیض العلوم جمشید پور۔

(ماہنامہ جام نور، فروری ۱۹۶۸ء)

بھیانک مایوسی

اب حالات کی سنگینی نے مسلمانان ہند کو اس نازک مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ مایوسی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ جان و مال کی تباہی اگر اتفاقی حادثوں کی طرح پیش آنے والی کوئی بات ہوتی تو اپنے دل کو سمجھایا جاسکتا تھا، لیکن اب یہ شہری درندوں کے لیے شب و روز کا معمول بن چکا ہے۔ نہ اب کسی طبقے کی تخصیص ہے نہ کسی خطے کا استثناء، سارا ہندوستان بلا تفریق لرزہ خیز مظالم کا خوگر بنتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف حکومتوں کی شرمناک بے بسی کا عالم یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دشمنوں کی صفیں الٹنے کے لیے اس کے پاس فوج اور اسلحے کی قوت سب کچھ موجود ہے، لیکن آبادیوں کے اندر امن و سلامتی کے غارت گروں کا رخ پھیرنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہے کہ بسا اوقات حکومت کی پولیس خود بلوائیوں کے لیے دیوار پناہ بن جاتی ہے۔ چوروں سے تو پنپنا جاسکتا ہے، لیکن پاسبانوں سے پنپنا بہت مشکل ہے۔ مسلمانوں کو بلوائی بھی پیٹتے ہیں اور پولیس بھی اپنی سنگینیوں کا نشانہ بناتی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اپنی تاریخ کی معنوی قوتوں پر اعتماد کر کے انتہائی پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔

صوبہ بہار کی پیش قدمی: پیہم فسادات اور خون رستے ہوئے زخموں نے ہماری زندگی کو جن بیتابیوں سے معمور کر دیا ہے، وہ وقت کا سب سے بڑا ماتم ہے۔ اب ہمیں پوری جرأت و رندانہ کے ساتھ حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رد و لفظوں میں اپنے مستقبل کا آخری فیصلہ لینا ہے۔ خوف و مایوسی کے اس ویرانے میں صوبہ بہار نے سیوان کانفرنس کے

انقلاب کا فیصلہ کر کے امیدوں کا ایک چراغ جلایا ہے۔ ’بہار صوبائی سنی کانفرنس‘ کا یہ تاریخی اجلاس ۱۰/۱۲/۱۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سیوان میں منعقد ہو رہا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق استقبالیہ کمیٹی دولاکھ سامعین کی نشست کا انتظام کر رہی ہے۔ صوبے کے مختلف اضلاع سے دو ہزار ڈیلی گیٹ کانفرنس میں شریک ہو رہے ہیں۔ خبر ملی ہے کہ ملک کے طول و عرض سے تقریباً ڈھائی سو علماء، مشائخ اور مفکرین و قائدین کا ایک عظیم الشان کارواں سیوان کی سرزمین پر اتر رہا ہے۔ ذہین اور قابل اعتماد حلقوں میں اس کانفرنس کو اہل حق کی اجتماعی بہبود اور دینی تنظیم کے لیے ایک نتیجہ خیز کوشش سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ وہ مرکزی مسائل جن کے ارگرد کانفرنس کی سرگرمیاں متحرک ہیں، یہ ہیں:

(۲) فرقہ وارانہ فسادات کا انسداد (۲) عملی اور اعتقادی مفاسد سے ملت کی تطہیر
(۳) تنظیم و یک جہتی (۴) اردو زبان کے ساتھ انصاف کا مطالبہ (۵) ریاستی سطح پر ایک ادارہ شریعیہ کا قیام۔

کانفرنس کے لیے پر جوش امنگوں کی ایک جھلک:- ملک کے طول و عرض میں کانفرنس کا جس طرح پر تپاک خیر مقدم کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ ذیل کی خبروں سے لگائیے۔ مجاہد دوراں مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی سرپرست مجلس استقبالیہ نے اطلاع دی ہے کہ شہزادہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت حضور مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم روحانی مسرتوں اور حوصلہ انگیز برکتوں کے ساتھ کانفرنس میں شرکت فرما رہے ہیں۔ حضور برہان الملتہ صدر کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ نے جبل پور سے یہ پیغام ارسال فرمایا ہے کہ اسلامیان ہند کے مستقبل کے لیے ایک نوید بہار سمجھ کر وہ اس کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہیں، موصوف نے کانفرنس کی صدارت کے لیے استقبالیہ کی پیش کش قبول فرمائی ہے۔

سید العلماء حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ صاحب قبلہ صدر آل انڈیائی سنی جمعیۃ العلماء بمبئی نے کانفرنس کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ موصوف بھی اپنے رفقا کے ساتھ کانفرنس میں شرکت فرما رہے ہیں۔ سلطان المتکلمین حضرت مولانا شاہ

رفاقت حسین صاحب قبلہ مفتی اعظم کان پور اور مجاہد ملت حضرت مولانا الحاج شاہ محمد حبیب الرحمن صاحب قبلہ اور حضرت شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور نے کانفرنس کی کامیابی کے لیے اپنی بہترین آرزوؤں کا اظہار فرمایا ہے، یہ حضرات بھی کانفرنس میں تشریف لارہے ہیں: خطیب مشرق حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب نظامی، سحبان الہند حضرت مولانا ابو الوفا فصیحی اور مجاہد بیباک حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی کانفرنس سے کئی دن پہلے سیوان پہنچ رہے ہیں، تاکہ انتظامات کا جائزہ لے سکیں۔ مفتی نیپال حضرت مولانا انیس عالم صاحب ناظم استقبالیہ نے اطلاع دی ہے کہ سیوان سے لے کر چھپرہ اور دیہی حلقوں تک سارا علاقہ کانفرنس کی ہماہمی کے لیے ایک میدان رزم بنا ہوا ہے۔ راقم الحروف بھی ۲۰ اپریل تک سیوان پہنچ رہا ہے۔

جام نور کا خورشید رسالت نمبر:- اسی شمارے میں کسی صفحے پر ”خورشید رسالت نمبر“ کے عنوانات کی ایک فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ عنوانات ہی سے اس نمبر کی ندرت و دلکشی کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ ملک کے جملہ عاشقان رسول سے ہم التجا کرتے ہیں کہ وہ بارگاہ رسالت میں خراج عقیدت کے طور پر اس نمبر کی اشاعت کا اہتمام کریں۔

یہ اعلان ضرور پڑھیے:- یہ نمبر ماہ ربیع الاول یعنی جون میں شائع کیا جائے گا، کانفرنس کی بے پناہ مصروفیات کے باعث مئی اور جون کا شمارہ بھی مشترک ہوگا، ہمیں یقین ہے کہ ”خورشید رسالت نمبر“ کی ضخامت اس نانغے کے نقصان کی تلافی کر دے گی۔ اس سلسلے میں ایک ضروری اعلان یہ ہے کہ ”خورشید رسالت نمبر“ اتنے ہی تعداد میں چھپ رہا ہے جتنی تعداد خریداروں، ایجنٹوں اور آرڈر دینے والوں کی ضرورت پوری کر سکتی ہے، اس لیے حسب دستور بک پوسٹ کے ذریعہ یہ نمبر بھی خریداروں کو ارسال کیا جائے گا، اگر ڈاکخانہ والوں کی غفلت سے کہیں ضائع ہو گیا تو دوبارہ ہم نہیں بھیج سکیں گے، اس لیے خریداروں اور آرڈر دینے والوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ الگ سے رجسٹری فیس کی رقم بھیج دیں، تاکہ یقینی طور پر ”خورشید رسالت نمبر“ ان تک پہنچ جائے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، اپریل ۱۹۶۸ء)

خطرے کا نشان

ذرا آنکھیں کھول کر دیکھئے! گورستانوں میں سونے والی قومیں آج انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہیں۔ اپنے طبقاتی وجود کو مٹنے سے بچانے کے لیے انہوں نے سردھڑکی بازی لگا دی ہے۔ ساری دنیا ایک سوچی سمجھی منزل کی طرف بے تحاشا بھاگتی جا رہی ہے۔ لیکن جمود طاری ہے تو بس قوم مسلم پر اور اس میں بھی حق کی نمائندگی کرنے والی جماعت جسے ہم اہل سنت کہتے ہیں، بری طرح خواب غفلت میں مدھوش ہے۔ جماعتی زندگی کا تصور اس کے رہنماؤں کے ذہن سے دن بدن اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو جماعت کا جو پیوند اہل سنت کے ساتھ ہے وہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ چھوٹی چھوٹی منڈلیوں میں ہم نے اپنے آپ کو کچھ اس طرح تقسیم کر لیا ہے کہ کسی وسیع میدان میں قدم رکھتے ہوئے انقباض محسوس ہونے لگتا ہے۔ وحدت فکر و خیال کے لحاظ سے دنیا کی ہم منظم ترین جماعت ہیں۔ پانچ کروڑ انسانوں کے انبوه کثیر میں کسی رخ سے بھی کہیں کوئی ذہنی انتشار اور فکری تعارض ہمارے درمیان نہیں ہے، لیکن ہم آہنگ ہو کر کسی مقصد کے گرد جمع ہو جانا ہمارے لیے سب سے مشکل کام ہے۔ خدا نخواستہ میں اپنی جماعتی روایات کی مذمت نہیں کر رہا ہوں، صرف احوال واقعی کا اظہار مقصود ہے۔

ہمارے جذبات کے تلاطم کا بھی ایک خاص موسم اور ایک خاص محرک ہے۔ ربیع الاول اور ربیع الثانی کا چاند نظر آتے ہی ہم اپنی تمام ظاہری اور معنوی صلاحیتوں کے ساتھ جاگ اٹھتے ہیں۔ میلاد کی محافل، جلسوں کے انعقاد اور گیارہویں شریف کی تقریبات کے لیے جان، مال اور وقت کی قربانی پیش کرتے ہوئے ہماری روحانی نشاط کا عالم قابل دید ہوتا ہے،

لیکن ٹھیک اس وقت جب کہ ہماری جماعت کے خوشحال افراد اپنی تجوری کا دریچہ کھول کر میلا دو فاقہ کی مدات پر اپنے حوصلوں کی بازی لگا رہے ہوں۔ اگر آپ ان سے درخواست کریں کہ عالم پناہ! آپ کی ان مذہبی روایات کا نام و نشان مٹانے کے لیے غارت گروں کی ایک فوج منظم کی جا رہی ہے۔ یہ روایات ہی اگر مٹ گئیں تو آپ کا یہ ہنگامہ شوق کون دیکھئے آئے گا؟ اس لیے دشمن کے حملوں کا دفاع کرنے کے لیے ہمیں بھی اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو ایک مرکز پر سمیٹ لینا چاہئے تاکہ اجتماعی جدوجہد کے مورچے سے ہم اپنے مذہب کا تحفظ کر سکیں، تو یقین کیجیے کہ ان کے حوصلوں کا چڑھا ہوا دریا آن واحد میں اتر جائے گا۔ حالاں کہ اسلام کی تاریخ یہ ہے کہ مسجدیں بعد میں بنی ہیں پہلے قربانیوں کی ایک طویل مسافت طے کر کے جماعت کو غالب و طاقت ور بنایا گیا۔ تاریخ کے مصنف کے سامنے اصل جواب دہ ہمارے علمائے کرام ہیں، جن کے دوش مبارک پر مذہب کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ آج کے دور کشاکش میں اگر ہماری ملت طیبہ کے رہنماؤں نے اپنا فرض نہیں ادا کیا تو آنے والا مورخ انہیں کبھی نہیں معاف کرے گا۔

ادارہ شرعیہ بہار کا دورہ: خدا کا شکر ہے کہ انہی مایوس کن اندھیروں میں کہیں کہیں امید کی کرن بھی چمک رہی ہے۔ بہار صوبائی سنی کانفرنس سیوان کے کٹن سے بنام ”ادارہ شرعیہ بہار“ جس ادارہ نے جنم لیا تھا اس کے متعلق یہ معلوم کر کے آپ کو خوشی ہوگی کہ اس کا کام کئی قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ پٹنہ میں اس کا مرکزی دفتر پرانی عمارت سے ایک نئی اور عالی شان دو منزلہ عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ ایک صدر مفتی، ایک نائب مفتی، ایک مبلغ اور ایک دفتر کلرک، نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۰ جولائی کو حضرت مجاہد ملت مولانا محمد حبیب الرحمن صاحب، حضرت مولانا شاہ رفاقت حسین صاحب مفتی اعظم کانپور، شیر نیتان اسلام حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی، مفتی نیپال حضرت مولانا انیس عالم صاحب (فاتح جمشید پور حضرت مولانا) ارشد القادری اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب کامل پٹنہ مرکزی دفتر میں جمع ہوئے۔ کئی دن کے دوران قیام میں ادارہ کے نہایت اہم اہم

مسائل طے ہوئے۔ پٹنہ اور مضافات کے علماء و مشائخ اور عمائدین کے متعدد اجتماعات میں ادارہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی۔ خانقاہوں کے اکثر مشائخ نے اپنے پر جوش تعاون کا یقین دلایا۔ خاص طور پر حضور سرکار پٹنہ حضرت مولانا شاہ فدا حسین صاحب قبلہ اور ان کے متعلقین کی ہمدردیوں کو ہم کبھی نہیں فراموش کریں گے۔ ایک قرارداد کے ذریعہ یہ بات بھی طے پائی کہ ادارہ شریعیہ کی ممبر سازی کی ہم سارے بہار میں اس طرح چلائی جائے کہ اکتوبر تک ممبران کی تعداد پچاس ہزار کے نشانے تک پہنچ جائے۔ اسی موقع پر یہ بات بھی طے پائی کہ اکتوبر تک کارکنوں کا ایک اجتماع عام کیا جائے۔

ہم یہ اعتراف کرتے ہوئے غایت درجہ خوشی محسوس کرتے ہیں کہ پٹنہ کے بیشتر اخبارات و جرائد نے ہمارے نیک مقاصد کا پر جوش خیر مقدم کیا اور کر رہے ہیں۔ ادارہ کے مرکزی دارالافتاء کے لیے حضرت علامہ مفتی عبدالحفیظ صاحب قادری مجیدی نے صدر مفتی کی حیثیت سے اپنی گرانقدر خدمات پیش فرمائی، جب کہ نائب مفتی کی حیثیت سے حضرت مولانا حافظ عبدالحفیظ صاحب بحال کیے گئے۔ اب ذیل میں ہمارے وفد کے دورہ کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیے۔

سیوان:- مذکورہ بالا حضرات پر مشتمل ہمارا یہ موقر وفد ۱۳ جولائی ۶۸ء کو سیوان پہنچا۔ وہی سیوان جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو امید کی ایک کرن دکھائی ہے۔ وہاں کے درد مند اور پر خلوص مسلمانوں نے ہمارے وفد کا جتنا پر تپاک خیر مقدم کیا اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ نیا قلعہ سے لے کر دربار تک سارے عوام و خواص ہمارے دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے بچھ گئے۔ کانفرنس کے کارکنوں اور نوجوانوں کی ٹیم نے ادارہ کی ممبر سازی کی اتنی تیز مہم چلائی کہ دودن میں ممبران کی تعداد پانچ سو سے زائد پہنچ گئی۔ سیوان کے دوران قیام کئی جلسہ عام کو ہمارے علمائے کرام نے خطاب فرمایا۔ ادارہ شریعیہ کی فوری ضرورتوں کے لیے سیوان کے باہمت مسلمانوں نے مبلغ نو سو روپے کی تھیلی ریکس وفد حضرت علامہ شاہ مفتی رفاقت حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں پیش کی۔ سیوان کی باقی تفصیلات آئندہ کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

جمشید پور:- سیوان سے واپسی میں ہمارا یہ معزز وفد جمشید پور پہنچا، حسن اتفاق سے حضرت استاذ العلماء شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور اور حسان الہند حضرت بیکل اتساہی اس وقت بسلسلہ اجلاس جمشید پور رونق افروز تھے۔ حضرت مفتی اعظم کان پور، حضرت مجاہد ملت اور حضرت استاذ العلماء ان تینوں اکابر کا یہ اجتماع بہت زیادہ باعث برکت ثابت ہوا اور وہ یہ ہے کہ ادارہ شریعیہ کے زیر اہتمام ایک مرکزی دارالقضاء کے قیام پر غور و فکر کر کے بہت سارے ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔

راپڑی:- ہمارا یہ موقر وفد پیر طریقت حضرت مولانا سید شاہ عبدالحق صاحب مہتمم مدرسہ غریب نواز راپڑی کی دعوت پر اس عظیم الشان اجلاس میں شریک ہوا، جو مدرسہ غریب نواز کی عالیشان عمارت کے افتتاح کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا۔ حضرت استاذ العلماء اور حضرت بیکل اتساہی بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ قاضی مظہر الحق صاحب، سردار جیلانی صاحب اور دھروا کے کارکنوں نے ادارہ شریعیہ کے لیے اپنے بہترین تعاون کا یقین دلایا۔

جمشید پور:- پیہم اجلاس کے سلسلے میں حضرت مفتی اعظم کانپور کو جمشید پور میں ایک ہفتہ قیام کرنا پڑا۔ وہاں سے حضرت مفتی اعظم کانپور کی ہمراہی میں ہم ناگپور پہنچے، حضرت شیخ الجامعہ مفتی عبد الرشید خاں صاحب سے وہاں کے حالات معلوم کرنے کے بعد پھر فساد زدہ علاقوں کے افراد اور ریلیف کے کارکنوں سے ملاقات کی۔ مظلوموں کی سرگزشت سن کر دل لرز اٹھا۔ سب کے بیان میں اتنا حصہ قدر مشترک تھا کہ وہاں کے پولیس افسران بلوائیوں کے ساتھ تھے۔

واپسی:- ناگپور کی واپسی میں راج مند گاؤں جلسہ سیرت غوث پاک کے سلسلے میں دودن قیام کرنا پڑا۔ وہاں سے مولانا فاروق کے اصرار پر رائے پور چند گھنٹے کے لیے اترے اور حضرت مولانا الحاج شاہ محمد حامد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی گئی۔ جمشید پور پہنچ کر ہمارا یہ وفد گھاٹ شیلہ کے لیے روانہ ہو گیا، جہاں ایک عظیم الشان جلسہ میلاد کو خطاب کیا گیا، وہاں سے حضرت مفتی اعظم کانپور اپنے مستقر کے لیے روانہ ہو گئے اور میں کلکتہ چلا آیا۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، اگست ۱۹۶۸ء)

سیوان سے پٹنہ تک

کتنی ار جند و فرخندہ فال تھی وہ شام بھی جس کی زلفوں کے سائے میں بیٹھ کر ہم نے سیوان کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا۔ گویا ہم ”چراغ رخ زیبا“ لے کر اپنی متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے اور اب اپنی آبلہ پائی کا کوئی شکوہ نہیں ہے کہ ہم نے منزل مقصود کو پایا۔ سیوان کانفرنس کی یہ برکت ہم کبھی فراموش نہیں کریں گے کہ وہ ہمیں نقطہ انجماد سے زندگی کی حرارت کی طرف اچانک واپس لے آئی اور اس نے حیرت انگیز طریقے پر ہمیں یاس و جمود کی تاریکی سے نکال کر مسرت و امید کے اجالے میں لاکھڑا کیا۔ فکر و اعتقاد کی یک جہتی اور وحدت خیال کی برتری کا وہ نظارہ بھی کتنا دلکش اور روح پرور تھا جب کہ گنبد خضرا کے پرچم کے نیچے تین لاکھ فرزندان اسلام زمین کے طول و عرض سے سمٹ آئے تھے۔ انسانوں کے اس لہراتے ہوئے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ہمارا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ حالات کے رحم و کرم پر جینے کے بجائے اب میدانِ عمل کی طرف بڑھنے کا وقت آ گیا ہے۔ غالباً اسی فرخندہ فال اجتماع کی برکت تھی کہ سیوان کے بعد سے ہمارے سفر کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پایا۔ ہر نئی صبح کا آفتاب تازہ امنگوں کے ساتھ ہم پر طلوع ہوا جب کہ ہر شام کا سورج ہمارے عزم و خیال کی ایک نئی دنیا کو سلام کرتا ہوا ہم سے اوجھل ہو گیا۔ مبارکباد ہماری ہمت مردانہ کو کہ ہم نامساعد حالات میں بھی چلتے رہے، یہاں تک کہ سیوان سے چل کر ہم بہار کی راجدھانی میں پہنچے اور بجلیوں کی زد پر ایک ایشیائی کی بنا ڈال دی۔

معاذ اللہ! فقر و عشق کے دیوانوں کا جبروت و دبدبہ بھی کتنا لرزہ خیز ہوتا ہے؟ ادھر خبر اڑی کہ سیوان کی طرف عشاق کے قافلے جاہد پیا ہیں اور ادھر سگان دنیا میں ایک شور

قیامت برپا ہو گیا۔ جیسے قافلے نہیں چل رہے ہوں مہتاب کی کرن پھوٹ رہی ہو۔ جن طوفانوں اور فتنہ سامانیوں کی یلغار سے ہمیں سیوان میں گزرنا پڑا تھا بالکل اسی طرح کے حالات ہمیں پٹنہ میں بھی پیش آئے تھے۔ ۱۲/۱۳ نومبر کے لیے ادارہ شرعیہ بہار کے دوروزہ اجلاس کا اعلان ہوتے ہی باز یگران سیاست پر وحشتوں کا دورہ شروع ہو گیا۔ شر اور زر کے غلاموں نے اجلاس کو ناکام بنانے کے لیے رذالت و شیطنت اور دروغ و افترا کے ایسے ایسے طوفان اٹھائے کہ آسمان سے نکالے ہوئے شیطان کو بھی پسینہ آ گیا لیکن قربان جانیے اس رحمت یزدانی کے، جو ہر نازک گھڑی میں اپنے محبوب کے بے سرو سامان گداؤں کی حمایت فرماتی ہے، وہ بادلوں کے اوٹ سے اتر آئی اور اس نے عظیم آباد کی سر زمین پر اپنے محبوب کے دیوانوں کا بھرم رکھ لیا۔

دوروزہ اجلاس کی کارروائی:۔ خدا کا شکر ہے کہ ہزار تحریمی کارروائیوں کے باوجود ادارہ شرعیہ بہار کا دوروزہ اجلاس اپنی طاہری اور معنوی شوکتوں کے ساتھ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوا۔ اجلاس میں شرکت کے لیے بہار کے انیس اضلاع سے تقریباً پندرہ سو ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ علماء و مشائخ کی تعداد اسی سے متجاوز تھی۔ عام حاضرین کا شمار بیس اور پچیس ہزار کے درمیان تھا۔ انجمن اسلامیہ ہال کے اندر، باہر اور اشوک راج پتھ پر ۹ بجے شب سے لے کر ڈھائی بجے رات تک سامعین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ مین روڈ پر دور دور تک شرفاء و حکام کی کاروں کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی۔ رات کے سناٹے میں ایمان افروز اور حوصلہ انگیز تقریروں کا ایسا سماں بندھا تھا کہ جو جہاں کھڑا تھا وہیں محویت شوق کے عالم میں کھڑا رہا۔ لوگوں پر کیف و خمار کا عالم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شخص عشق و عرفان کی بارش میں شرابور ہو گیا ہو۔ تاثرات کا ایک عجیب رد عمل ملاحظہ فرمائیے کہ آخری اجلاس کی صبح کو سارا پٹنہ ان شاطران وقت پر نفیس و ملامت کر رہا تھا جو اپنے آقاؤں کا حق نمک ادا کرنے کے لیے عام مسلمانوں کو اجلاس کی شرکت سے روک رہے تھے۔

تاجدار اہل سنت شہزادہ اعلیٰ حضرت سرکار مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ کی شرکت نے اجلاس میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ان کے چہرہ پر نور کی شعاعوں سے ساری

بزمِ بقعہ نور معلوم ہو رہی تھی۔ جس وقت وہ پروانوں کے ہجوم میں تشریف لائے، ہر طرف جلوؤں کی بہار آگئی۔ وہ مشاہیر علمائے اہل سنت جن کی کیفِ بارتقیریوں سے دلوں کی سرزمین مسخر ہوئی اور اپنے مفتوحہ علاقوں میں جنہوں نے عشقِ رسالت کے فیضان کا علم نصب کیا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سید العلماء حضرت اقدس علامہ شاہ سید آل مصطفیٰ صاحب صدر آل انڈیائی جمعیۃ العلماء بمبئی، استاذ العلماء حضرت علامہ حافظ عبدالعزیز صاحب قبلہ شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور، سلطان المناظرین حضرت علامہ شاہ رفاقت حسین صاحب مفتی اعظم کانپور، مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمن صاحب رئیس اعظم اڑیسہ، امام الاذکیا حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب جوئی، سبحان الہند حضرت مولانا ابوالوفا صاحب فصیحی، مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی، خطیب مشرق حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب نظامی، بحر العلوم حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی، شاعر نعت حضرت راز الہ آبادی اور عندلیب گلشن رسالت حضرت قمر سلیمانی۔ ان حضرات کے علاوہ بہار کے بہت سارے مشاہیر نے اپنی شرکت سے اجلاس کو رونق بخشی۔ جن میں سے شیخ بہار حضرت مولانا سید شاہ فدا حسین صاحب قبلہ سرکار پٹنہ، حضرت سجادہ نشین صاحب درگاہ مبتین گھاٹ، محسن ملت حضرت مولانا الحاج انیس عالم صاحب مفتی نیپال سیوان، حضرت مولانا شاہ سراج الہدیٰ صاحب شہر گیا، حضرت مولانا سید الزماں صاحب جمہوی، حضرت مولانا عبدالحمید صاحب بستہ ڈاگلی، مولانا محمد میاں صاحب کامل، مولانا محمد احمد صاحب شاہدی، مولانا ابوشمیم صاحب برنپور، مولانا کاظم علی صاحب بستوی، مولانا ساجد اللہ صاحب بھاگلپوری، مولانا شاہجہاں صاحب بھاگلپوری، مولانا حیدر القادری صاحب مظفر پوری، مولانا ظفر الحسین صاحب پوکھریوی اور جناب مقبول عالم خاں صاحب ایڈوکیٹ سہرام کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دار القضا کا قیام:- ہندوستان میں کئی لاکھ مسلم خواتین ہیں جن کی ازدواجی زندگی آفات کے نشانے پر ہے۔ ان کے شوہر نہ حق زوجیت ادا کرتے ہیں نہ نان و نفقہ کی کفالت

کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں طلاق دے کر آزاد کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی آسائش و عزت نفس کا کوئی راستہ اپنے طور پر نکال سکیں۔ اپنی گلو خلاصی کے لیے وہ غیر مسلم حکام کی طرف بھی رجوع نہیں کر سکتیں کہ اسلام اپنے مذہبی امور میں کسی غیر مسلم کو مداخلت کا حق نہیں دیتا۔ ایسی عورتوں کی قرار واقعی مشکلات کے حل کے لیے چند ماہ ہوئے ادارہ شرعیہ بہار نے اہل سنت کے مشاہیر علماء سے ایک استغنا کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) آج کے حالات میں کیا از روئے شرع مسلمانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے معاشرتی اور ازدواجی معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے قاضی منتخب کریں؟

(۲) کیا مسلمانوں کے منتخب کردہ قاضی کو شرعی حق حاصل ہے کہ وہ مظلوم و مبتلا عورتوں کے مقدمات کی سماعت کر کے اپنی صوابدید کے مطابق فسخ نکاح کا حکم لگا سکے؟

چنانچہ ضرورت و مصلحت کے تحت فقہی عبارتوں کی روشنی میں حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب جون پوری، حضرت مولانا الحاج مفتی عبدالرشید خاں صاحب شیخ الجامعہ ناگپور، نائب مفتی اعظم حضرت مولانا شریف الحق صاحب امجدی، حضرت مولانا مفتی بدر الدین صاحب براؤں شریف اور حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب استاذ جامعہ فیض العلوم جمشید پور نے نہایت مدلل طور پر یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ علامہ مسلمین کو قطعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ازدواجی معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے کسی صحیح العقیدہ سنی عالم دین کو اپنا قاضی منتخب کر لیں۔ حسب ضرورت و مصلحت اس قاضی کو شرعاً بشرائط معہود فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہوگا۔

پٹنہ کے اجتماع میں ان موصول شدہ فتوؤں پر غور و خوض کرنے کے لیے سیدی حضور مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم کی سرپرستی میں اکابر علماء کی ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد حضور مفتی اعظم ہند نے موصول شدہ فتوؤں کی توثیق فرمادی۔ اس کے بعد حضرت سید العلماء مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ صاحب قبلہ برکاتی، حضرت استاذ العلماء حافظ عبد العزیز صاحب شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور، سلطان المتکلمین حضرت مولانا رفاقت حسین صاحب مفتی اعظم کانپور، مجاہد ملت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قبلہ، فتوؤں کی تائید میں اپنے اپنے دستخط ثبت فرمادیے۔ اب توفیق الہی شریک حال رہی تو عید بعد ادارہ شرعیہ

بہار کے مرکزی دفتر میں باضابطہ دارالقضاء کا قیام عمل میں آجائے گا۔

ادارہ شرعیہ بہار کے لیے ایک ذاتی عمارت کی ضرورت :- ادارہ شرعیہ بہار کے اغراض و مقاصد کے تحت شعبہ بیت المال، شعبہ دارالقضاء، شعبہ دارالافتاء، شعبہ دارالمبلغین و مدرسہ شرعیہ اور شعبہ تربیت گاہ برائے ائمہ مساجد کا قیام ضروری ہے، اس لیے اتنے وسیع شعبہ جات کے لیے کرایہ کی موجودہ عمارت قطعاً کافی ہے۔ لہذا پٹنہ کے اجتماع کے موقع پر ادارہ شرعیہ بہار کی مجلس نے طے کیا کہ پٹنہ میں ادارہ کے لیے ایک ذاتی عمارت خریدی جائے۔ چنانچہ مناسب مقام پر ایک عمارت پسند کر لی گئی ہے، جس کی قیمت تقریباً تیس ہزار ہے۔ اجلاس عام میں جیسے ہی حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب نے ادارہ شرعیہ کے لیے ذاتی عمارت کا ذکر کیا، لوگوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جمشید پور کی ایک فیکٹری کے افسر جناب غلام محمد صاحب گاما اس اعلان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ جذبہ شوق میں مانگ پر آ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی شعلہ بار تقریر کے دوران عمارت فنڈ کے لیے پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا۔ موصوف کے اس اعلان پر سارا مجمع نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔ مجلس برخاست ہو گئی، لیکن آج گاما صاحب کا تذکرہ لوگوں کی زبان پر ہے۔ عمارت کے لیے باقی رقوم کی فراہمی کی غرض سے عید بعد ادارہ شرعیہ کا ایک وفد بہار کا دورہ کرے گا۔ دردمندان ملت سے توقع ہے کہ وہ اس موقع پر اپنے دینی حوصلوں کی بہترین مثال قائم کریں گے۔

مجلس انسداد فسادات :- گزشتہ شمارے میں مجلس انسداد فسادات کی طرف سے جاری کردہ سوالنامہ قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا۔ پٹنہ کانفرنس کے موقع پر ۱۳ نومبر کو مجلس انسداد فسادات کا جلسہ شوریٰ منعقد ہوا، جس میں اکثر ممبران نے شرکت کی۔ ملک کے طول و عرض سے سوالنامے کے جواب میں انسداد فسادات کے سوال پر تقریباً چالیس تجویزیں موصول ہوئی تھیں۔ اجلاس میں ان تجاویز پر کئی گھنٹے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔ اخیر میں مختلف تجویزوں کے منتخب اجزا پر انسداد فسادات کے لیے ایک فارمولا مرتب کیا گیا، جس کا متن یہ ہے:

فارمولا برائے انسداد فسادات :- (الف) چونکہ امن و امان کے قیام کی ذمہ داری براہ راست مقامی ایڈمنسٹریشن پر ہے، اس لیے ریاستی اور مرکزی حکومتیں واضح طور پر ایسا قانون وضع کریں کہ جہاں کہیں بھی فرقہ وارانہ فساد ہو وہاں کے مقامی حکام کو اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے اپنا فرض نہیں ادا کیا، مجرم قرار دیا جائے اور انہیں معطل کر کے فوراً ان کے خلاف تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائے۔

(ب) جس تھانے میں مسلمان بہت زیادہ اقلیت میں ہوں وہاں پولیس کے دستے میں ۲۵ فیصد مسلمان ضرور رکھے جائیں۔

(ج) فیکٹری ایریا، سرکاری منطقوں اور کسی پرائیوٹ فرم کی کالونی میں مسلمانوں کو منتشر طور پر آباد کرنے کے بجائے انہیں ایک محفوظ پاٹ میں رہائش کی جگہ دی جائے، تاکہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اجتماعی طور پر وہ اپنا تحفظ کر سکیں اور حکومت کی انتظامیہ کو بھی ان کی مدد کرنے میں آسانی ہو۔

(د) قیام امن کے سلسلے میں حکومت اور سماجی کارکنوں کے تعاون کے لیے ”محافظ دستہ“ کے نام سے امن پسند نوجوانوں کا ایک والنٹیر کور قائم کیا جائے اور ان کے اندر خدمت وطن کا جذبہ پیدا کر کے آبادیوں کو ناخوشگوار واقعات سے محفوظ رکھا جائے۔ ہر آبادی کے غیر متعصب اور امن دوست افراد پر مشتمل ایک سوسائٹی قائم کی جائے جو آبادی کے باشندوں کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرے اور فضا میں کشیدگی کے اسباب کی روک تھام کرے۔

طے پایا کہ مذکورہ بالا فارمولا حکومتوں سے منوانے کے لیے پر امن جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

وزیراعظم حکومت ہند سے ایک وفد کی ملاقات :- ایک قرارداد کے مطابق انسداد فسادات کا فارمولا لے کر ۱۳ نومبر کو ایک وفد دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ وفد کے ارکان میں یہ خادم گمنام، حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی اور مسٹر محمد یوسف صاحب ایم پی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جناب یوسف صاحب ایم پی کے توسط سے وزیراعظم

سے ملاقات کے لیے ۲۰ نومبر کو پانچ بجے شام کا وقت طے پا گیا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر پارلیمنٹ کے چیمبر میں ان سے ملاقات ہوئی اور فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے پر کافی دیر تک ان سے بات چیت ہوئی۔ مجلس انسداد فسادات کا مرتب کیا ہوا فارمولا ان کے سامنے رکھا گیا جس پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کا انہوں نے وعدہ کیا۔

دوران گفتگو میں ان کی توجہ گروگوا لکڑ کی حالیہ اشتعال انگیز تقریروں کی طرف بھی مبذول کرائی، جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ بہت جلد ہم اس کے خلاف نوٹس لینے جارہے ہیں۔ ضمنی طور پر اس بات کا تذکرہ بھی آیا کہ کس طرح نا اہل لوگوں کے ذریعہ اب سنی اوقاف اور درگاہوں کی پامالی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

تازہ غم:۔ انسداد فسادات کے سلسلے میں دہلی کے سفر سے واپسی کے بعد ہی کلک کے خوں ریز فساد کی خبر موصول ہوئی۔ دوسرے دن احمد آباد اور ویرا دل کے افسوسناک واقعات کی اطلاع آئی۔ ان حالیہ فسادات سے اب یہ حقیقت بالکل برہنہ ہو گئی ہے کہ قومی یک جہتی کی ساری تجاویز فرقہ پرستوں کی جارحانہ یلغار کے آگے بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہندوستان کے حکمران اقلیت کی سلامتی کے لیے کون سا قدم اٹھاتے ہیں۔ حالات نے پرسکون مستقبل کی طرف سے ہمیں اتنا مایوس کر دیا ہے کہ اب شاید ہی ہمارے دلوں سے خوف و ہراس کی دھڑکن دور ہو سکے۔

جام نور پر حکومت کی چشم عنایت:۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ قارئین کو یہ خبر معلوم ہو گئی ہوگی کہ جام نور جیسا خالص مذہبی اور علمی رسالہ بھی حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا ہے۔ ستم بالائے ستم کی مثال اس سے زیادہ اور کہاں مل سکتی ہے کہ ہمیں لوٹا جائے، جلایا جائے، مارا جائے اور رونے بھی نہ دیا جائے۔ اس سیکولر اسٹیٹ میں ہر شخص کو زبان و قلم کی آزادی حاصل ہے۔ آگ برسانے والے شب و روز آگ برسا رہے ہیں، ان سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ صرف غریب مسلمان کی فریاد سے آنکھوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ویسے ادارہ جام نور نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حکومت کے قہر و جور کے آگے سپر ڈالنے کے بجائے وہ آئینی سطح پر اپنا دفاع کرے گا۔ خدا ہمیں اس پر خطر راہ میں ثابت قدم رکھے اور

صبر و ضبط کی توفیق عطا فرمائے۔

ذخیرہ آخرت:۔ عربی مدارس کے بہت سے غریب و نادار طلبہ کی درخواستیں دفتر میں موصول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی غربت و تنگدستی کی وجہ سے جام نور کا سالانہ چندہ نہیں ادا کر سکتے۔ کسی اہل خیر کو متوجہ کر دیا جائے کہ وہ زکوٰۃ فنڈ سے ہمارے نام رسالہ جاری کرادیں، جام نور کے مطالعہ سے ہمارے دینی معلومات میں اضافہ ہوگا اور اس کی روشنی میں دین کی جو بھی خدمت ہم کریں گے وہ بجا طور پر اس کے اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس تحریر کے ذریعہ میں اصحاب خیر کو متوجہ کرتا ہوں کہ وہ زکوٰۃ کی کچھ رقم بھیج کر ایسے مستحق شائقین کے نام پر رسالہ جاری کرادیں، دین کی خدمت بھی ہوگی، زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی۔ رقم بھیجتے وقت اس کی وضاحت کر دی جائے کہ یہ زکوٰۃ فنڈ کی رقم ہے۔ آپ کے حلقہ معلومات میں ایسے مستحق لوگ ہوں تو ان کے پتے بھیج دیجیے تاکہ ان کے نام رسالہ جاری کر دیا جائے، ورنہ اجازت دیجئے کہ ہم مستحق طلبہ کے نام رسالہ جاری کر دیں۔

مشرقی ہندوستان کا شہرہ آفاق دینی ادارہ:۔ جامعہ فیض العلوم جمشید پور کی دینی اور علمی برکتیں اب محتاج تعارف نہیں ہیں، سارے ملک میں اس کی روشنی پہنچ رہی ہے، رمضان المبارک کے اس موسم خیر میں دردمندان ملت اس کی طرف اپنی خصوصی توجہ مبذول فرمائیں۔ فیض العلوم کے مندرجہ ذیل رفقاء امدادی ہم پر ملک کا دورہ کر رہے ہیں، ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے۔ (۱) مولانا عبدالقدوس صاحب مونگیری احاطہ بمبئی (۲) حافظ حبیب الرحمن صاحب کلکتہ و مضافات۔ مسلمانان جمشید پور سے اس سے زیادہ اور ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ فیض العلوم کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینپا ہے، اپنے شاداب چمنستان آرزو کو مر جھانے سے بچائیں۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، دسمبر ۱۹۶۸ء)

وقت کے تقاضوں سے گریز کب تک؟

جی چاہتا ہے آج کھل کر اہل سنت کے عوام و خواص کو اپنے درد و کرب کا نالہ شب گیر سناؤں۔ آنکھوں کی نیند اگراڑ جائے تو مجھے معذور رکھیں گے۔ یوں بھی چوٹ کھائے ہوئے انسان سے درد کی بیتابی کے سوا اور کسی بات کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے۔ ایک عرصہ سے چیخ رہا ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو سوچنے اور برتنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ فولاد کی تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا، اب قلم کی تلوار سے معرکے سر کیے جا رہے ہیں۔ پہلے کسی محدود رقبے میں کفر و ضلالت کی اشاعت کے لیے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی تھی اور اب پریس کی بدولت صرف چند گھنٹوں میں شقاوتوں کا ایک عالمگیر سیلاب امنڈ سکتا ہے۔

ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے! آج ہندوستان کا ہر فرقہ قلم کی توانائی اور پریس کے وسائل سے کتنا مسلح ہو چکا ہے۔ اتنا مسلح کہ اس کی یلغار سے ہمارے دین کی سلامتی خطرے سے دوچار ہوتی جا رہی ہے، بلکہ میں بعض ایسی جماعتوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جن کے وجود کا کوئی سرشتہ ماضی میں نہیں ملتا، لیکن اس اجنبیت کے باوجود صرف قلم کے وسائل کے بل پر وہ روئے زمین پر طوفان کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں اور ان کا اجنبی لٹریچر سیکڑوں برس کی قابل اعتماد تصنیفات کو نہایت تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ فکری مزاج کی تعمیر میں قلم کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ فکری استحکام کے بغیر کوئی جماعت بھی طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پریس ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ فتنہ صبح کو جنم لیتا ہے، دوپہر تک جوان ہو جاتا ہے اور شام ہوتے ہوتے آبادیوں کے لیے ایک دردناک آزار بن جاتا ہے۔

ان حالات میں جب کہ باطل پرستوں کی یلغار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، ہم خفتگان شب غفلت کی نیند اور گہری ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں نکتہ چینی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، البتہ تعمیری ذہن رکھنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اجتماعی محاذوں پر جو لوگ کام کر رہے ہیں ان سے پوچھئے کہ کتنی کٹھنائیوں سے انہیں گزرنا پڑتا ہے، ساحل پہ کھڑے ہو کر ڈوبنے کا تماشا دیکھنا کوئی بہت بڑا ہنر نہیں ہے۔

پچھلے دنوں ہماری جماعت کے کئی جوان ہمت علماء نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور متعدد ماہناموں کے اجراء سے انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا، لیکن کچھ ہی دور چلنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس راہ میں بالکل تنہا ہیں، جماعت کا کوئی خاص تعاون انہیں حاصل نہیں ہے۔ بالآخر مسلسل پسپائیوں کی وجہ سے وہ تھک کر بیٹھ گئے اور مجبور ہو کر رسالہ انہیں بند کر دینا پڑا۔ بجائے اس کے کہ جماعت کے افراد ان کی مشکلات کا بوجھ آپس میں تقسیم کر کے انہیں کام کا سلسلہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے، اُلٹے ان کی ناکامی پر تالیاں بجانے لگے اور ان کی ناکامی ایک مثل بن گئی۔

ویسے گھائل ہمتوں کا مذاق اڑانا بہت آسان ہے، لیکن جن کا سابقہ صحافتی زندگی سے ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک صحافی کی زندگی کتنی پرسوز ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے پیش رو صحافیوں کی ناکامی کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آج کل عام طور پر اخبارات و رسائل صرف دو حالتوں میں زندہ رہتے ہیں یا تو وہ بالکل تجارتی اور بازاری قسم کے ہوں یا پھر کوئی فعال جماعت ان کی پشت پر ہو۔ تجارتی اور بازاری قسم سے ہماری مراد یہ ہے کہ نہ وہ کسی خاص مذہب فکر کے ترجمان ہوں اور نہ تجارتی اشتہارات اور تحریری مواد کے سلسلے میں حرام و حلال کے درمیان شرعی امتیازات کے وہ پابند ہوں۔ جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ مذہب حق کی حمایت اور باطل مذاہب کا استیصال ہی ہماری صحافت کا سنگ بنیاد ہے۔ کسی قیمت پر بھی ہم اپنے اس مشرب سے منحرف نہیں ہو سکتے۔

یوں ہی تجارتی اشتہارات اور تحریری مواد کے سلسلے میں بھی ہمارا معیار بہت سخت ہے۔ عورت مرد یا کسی بھی جاندار کی تصویر یا کوئی شرعاً قابل گرفت اشتہار یا مضمون ہم ہرگز نہیں

چھاپ سکتے، چاہے اس کا معاوضہ کتنا ہی ہمیں دیا جائے۔ اپنی اس سخت پالیسی کے نتیجے میں ہمارے مالی نقصانات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اب لے دے کے اپنے رسالوں کی زندگی کے وسائل کی اگر کوئی امید کی جاسکتی ہے تو صرف اپنی جماعت سے۔ تو اس کی سرگزشت اتنی شاندار ہے کہ بس ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اول تو ہمارے یہاں مطالعہ کا ذوق ہی بہت کم ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو جماعتی بہبود کا جذبہ برائے نام ہے، البتہ ہمارے یہاں جس کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ تقریروں کا سٹیج ہے، اس مد پر ہم لاکھوں لاکھ روپے بے دریغ لٹا دیتے ہیں اور ہمیں ذرا بھی ٹکان نہیں محسوس ہوتی، البتہ قلم کے ذریعہ دین کی خدمت کے سوال پر ہماری سردمہریوں کا تماشا قابل دید ہوتا ہے۔

آپ بیتی :- بہر حال ہمارے پیش رو حضرات اپنی صحافتی زندگی میں جن پرسوز حالات سے گزرے تھے، مجھے بھی ان حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑا۔ اپنی انتہائی مصروف زندگی کے باوجود دشمنوں کی قلمی یلغار سے متاثر ہو کر جب میں نے ”جام نور“ کا اجراء کیا تھا تو میرے ذہن میں مستقبل کی تصویر کچھ اور ہی تھی۔ میں اپنے تئیں قطعاً سمجھے ہوئے تھا کہ جماعت کو ایک ایسے ترجمان کی بہر حال ضرورت ہے جو ان کے اندر قوت عمل پیدا کرے اور مخالفین کے حملوں کا بھر پور جواب دے کر عام ذہنوں کو غبار آلود ہونے سے بچائے۔ چنانچہ ”جام نور“ نے اپنی دو سال کی مدت میں ان مقاصد کی کہاں تک تکمیل کی اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔

اب میں مسلسل خسارے کی وجہ سے اتنا شکستہ ہو چکا ہوں کہ آگے بڑھنے کی بالکل سکت باقی نہیں ہے۔ کہاں کہاں مجھے ٹھوکر لگی ہے اور کس کس سمت سے میں گھائل ہوا ہوں، یہ زندگی کی بڑی المناک سرگزشت ہے، بہتر ہے اس کی تفصیل نہ دریافت کی جائے۔

ضروری اعلان :- نہایت غم و اندوہ کے ساتھ اب اپنی خون آلود آرزوؤں کے مقتل سے ”جام نور“ کے شائقین کو باخبر کر رہا ہوں کہ وہ آئندہ ”جام نور“ کا چندہ نہ بھیجیں۔ اس اعلان کے بعد سے ”جام نور“ کا کوئی چندہ وصول نہیں کیا جائے گا۔

”جام نور“ اب اتنی ہی مدت تک جاری رہے گا جتنی مدت پرانے خریداروں کے لیے

مطلوب ہے۔ پرانے خریداروں کی مدت خریداری پوری ہو جانے کے بعد ”جام نور“ اپنے قدردانوں کو سلام کرتا ہوا رخصت ہو جائے گا۔ اس عبوری دور میں ان کتا بچوں اور رسالوں کے جوابات بھی ”تعزیرات قلم“ کے عنوانات کے تحت شائع کر دیے جائیں گے جو ہندو پاک کے مختلف حصوں سے موصول ہوئے ہیں اور جن میں اسلام کے معتقدات اور مذہب اہل سنت کی روایات پر نہایت سنگین حملے کیے گئے ہیں۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، فروری ۱۹۶۹ء)

راکھ کے نیچے چنگاری

دوستوں کے اخلاص کا تماشا یا تو مرنے کے بعد دیکھنے میں آتا ہے یا پھر موت کی آخری ہچکیوں کے وقت۔ جام نور کے حق میں کسی دانشور کی یہ بات صد فیصدی صحیح نکلی۔ گزشتہ شمارے میں جام نور کی مفارقت کا اعلان سنتے ہی بہت سے شائقین کی آنکھوں میں آنسو آگئے، دفتر میں موصول ہونے والے بے شمار ”تعزیتی خطوط“ پڑھ کر جام نور کے متعلق لوگوں کے گہرے جذبہ اخلاص کا اندازہ ہوا۔ جام نور کو زندہ رکھنے کے لیے متعدد احباب نے اپنے خون جگر تک کی پیش کش کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک صاحب نے مالی تعاون کے طور پر اپنی طرف سے ایک گرانقدر عطیہ ارسال فرمایا تھا، لیکن غیر یقینی حالات کے باعث اسے واپس کر دیا گیا۔

چشمہائے پرہیزگار: لاہور سے حضرت حکیم نظامی دہلوی اور حضرت مولانا باغ علی نسیم، احمد آباد سے قاری اسماعیل بیکاروی، امر وہہ سے حضرت مولانا قاضی محبوب احمد صاحب، ادے پور سے مولانا حبیب الرحمن، ناگ پور سے محترمہ خیر النساء بخش، گوپال گنج سارن سے مولانا عبدالقادر رحمانی، مالوگاؤں سے ماسٹر نثار احمد صاحب عبدالحمید، گورکھپور سے جناب مشتاق احمد صاحب بلیاوی، میسور سے عبدالقادر صاحب، کان پور سے حافظ محمد سعید، براؤں شریف سے حضرت مولانا نسیم بستوی، سیوان سے حضرت مولانا انیس عالم صاحب، کوٹہ سے حضرت مولانا اسرار الحق صاحب، جبل پور سے حضور برہان الملتہ، رائے پور سے حضرت مولانا حسن خاں جھبھری، بنگلور سے حضرت سید غلام دستگیر وغیرہم بے شمار حضرات نے جام نور کے بند کیے جانے کے اعلان پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اسے ملت کا ایک عظیم نقصان

قرار دیا ہے اور اصرار فرمایا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جام نور کو زندہ رکھا جائے۔ بعض حضرات نے تو یہاں تک مشورہ دیا ہے کہ عبوری دور میں اس کے صفحات اور کم کر دیے جائیں، لیکن اسے بہر صورت جاری رکھا جائے۔

جذبہ اخلاص کا رد عمل:۔ جام نور سے متعلق اپنے دردمندوں کے غمگین تاثرات کا ہمارے اور ہمارے رفقاء کے اوپر نہایت شدید رد عمل ہوا ہے، چنانچہ ہمارے نمکسار ہمدردوں کو اس خبر سے خوشی ہوگی کہ رفقاء ادارہ کی ایک نشست میں یہ بات طے پاگئی ہے کہ جام نور کو مندرجہ ذیل پابندیوں کے ساتھ جاری رکھا جائے گا۔ (۱) مالی مشکلات کا دور ختم ہونے تک اس کے صفحات گھٹا کر ۱۶ کر دیے جائیں گے اور اس کی قیمت چار آنے رکھی جائے گی۔ (نوٹ:۔ قیمت کے تناسب سے پچھلے خریداروں کی مدت خریداری میں اتنی توسیع کر دی جائے گی کہ انہیں پورا معاوضہ مل جائے)۔

(۲) کام اتنا مختصر کر دیا جائے گا کہ بغیر کسی ملازم کے بھی سلسلہ جاری رکھا جاسکے۔ چنانچہ تفصیل میں یہ بات طے پاگئی کہ اب چندہ خریداری کا سسٹم ختم کر دیا جائے گا، تاکہ ہر ماہ ہزاروں پیکٹ بنانے، ان پر پتوں کی چٹ چسپاں کرنے اور خریداروں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ مصروف رہنے کی زحمت سے نجات ملے۔

متبادل صورت:۔ یہ سلسلہ ختم کرنے کے بعد جام نور کو شائقین تک پہنچانے کی اب متبادل صورت تجویز کی گئی کہ شہر اور قصبہ کے سرگرم حامیوں سے درخواست کی جائے کہ وہ ازراہ جذبہ ملی اپنے یہاں جام نور کے قارئین کا ایک حلقہ تیار کریں اور ان کی صحیح تعداد سے مطلع کریں تاکہ اتنی کاپیاں ہر ماہ ان کے پتے پر ایک ہی جگہ بھیج دی جائیں اور وہ قارئین تک پہنچا کر قیمت دفتر کو واپس کر دیں۔ چاہیں تو ۲۵ فیصدی کے حساب سے کمیشن وضع کر لیں یا یہ خدمت رضا کارانہ طور پر انجام دیں۔

دوسری تجویز:۔ جام نور کے مستقبل کو مالی مشکلات سے بچانے کے لیے ایک تجویز یہ بھی لوگوں نے پیش کی ہے کہ اپنے مقام سے تجارت پیشہ حضرات سے اجرت پر تجارتی اشتہارات حاصل کیے جائیں۔ تجارتی اشتہار کا نرخ نامہ یہ ہے:

اندرونی صفحات کا ایک کالم پندرہ روپیے ماہوار، کالم کا تیسرا حصہ پانچ روپیے ماہوار، ایک پورا صفحہ تیس روپیے ماہوار۔ یہ اشتہارات پورے ایک سال، چھ مہینے، تین مہینے اور ایک ماہ کے لیے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ہم اپنے دردمندوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ازراہ جذبہ ملی اپنے حلقہ اثر سے کوئی تجارتی اشتہار حاصل کر کے ممنون فرمائیں گے۔

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، مارچ/اپریل ۱۹۶۹ء)

سامان عبرت

جمشید پور کے حالیہ فساد کو مسلم اقلیت کی مالی اور جانی تباہ کاریوں کے اعتبار سے جس درجہ لرزہ خیز قرار دیا گیا ہے اس کی مثال بھارت کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ مظالم کی جو تفصیلات اخبارات کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں وہ ملک کے سیاسی مدبرین اور ارباب حل و عقد کے لیے انتہائی تشویش ناک ہیں۔ پندرہ کروڑ افراد پر مشتمل کسی ملک کی اقلیت کا اپنے متعلق یہ فیصلہ کر لینا کہ ہماری جان و مال اور عزت و آبرو اس ملک میں محفوظ نہیں ہے، تاریخ کا ایک نہایت سنگین واقعہ ہے۔ ملک کا انتظام جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ ان کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ ملک کی اقلیتوں اور کمزور طبقوں کی وہ نہایت بے لاگ طریقے پر حفاظت کریں۔ ملک کی فرقہ پرست طاقتوں اور سماج دشمن عناصر کو کچلنے میں اگر انہوں نے ذرا بھی سیاسی مصلحتوں سے کام لیا تو ملک کا انتظامی ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

آگ اور خون کی خبروں کے ساتھ ساتھ جمشید پور سے ایک اور خبر بھی ہم تک پہنچی ہے، جس نے مسلم معاشرہ میں ایک ”نئے قاتل“ کی نشان دہی کی ہے۔ جماعت اسلامی کے بارے میں اہل سنت کا پریس اس طرح کی کوئی خبر نشر کرتا تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ ایک مذہبی حریف کے خلاف ایک مذہبی حریف کا بے بنیاد الزام ہے، لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ اردو کے وہ اخبارات جو اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی کے لیے ملک گیر شہرت کے حامل ہیں وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ جمشید پور کے فساد میں آرائیس ایس اور جماعت اسلامی دونوں کا مشترک طور پر ہاتھ ہے۔

اس خبر کو اس واقعہ سے بھی مدد ملتی ہے کہ فساد کے فوراً ہی بعد جب امیر جماعت اسلامی

ہندمولوی محمد یوسف صاحب جمشید پور کے مظلوم مسلمانوں کے پاس ریلیف لے کر پہنچے تو کسی کیمپ میں بھی انہیں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ مسلمانوں نے یہ کہہ کر ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا کہ قاتلوں کے ہاتھ سے ہم کوئی امداد نہیں قبول کریں گے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہر فساد کے موقع پر ریلیف دوکان لگانے والی جماعت اسلامی اس بار جمشید پور میں ریلیف کی کوئی دوکان منظر عام پر نہیں کھول سکی۔ تاریخ کا یہ نیا واقعہ بلا وجہ نہیں ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی والے اس بات کی ہمت نہیں کر سکے کہ وہ ریلیف کمیٹی کے کارپرداز کی حیثیت سے جمشید پور کے مظلوم مسلمانوں کا سامنا کر سکیں۔ جماعت اسلامی کے چہرے کا یہ نیارخ جو آرائیں ایس کے ساتھ گہری اور پر خلوص دوستی کے نتیجے میں منظر عام پر آیا ہے، وہ علمائے اہل سنت کے اس فکری موقف کی توثیق کے لیے کافی ہے جو آج سے سالہا سال پیشتر ہم جماعت اسلامی کے متعلق قوم کے سامنے پیش کر چکے ہیں کہ جماعت اسلامی خدا اور رسول کے مقرر کردہ خطوط سے ہٹ کر الگ اپنی راہ بنالی ہے، جو صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے مقدس گروہ سے ہٹ کر اپنی شخصی قیادت کی بنیاد پر ایک نئے گروہ کی تشکیل چاہتی ہے، اس کی جگہ مسلم معاشرہ میں نہیں ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن کفر کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے ساتھ معاہدہ کر کے مسلمانوں کی حریف بننے کی پوزیشن ضرور اختیار کرے گی، کیونکہ مدینے کے منافقین کا یہی کردار تھا۔ وہ بھی چڑھتے سورج کے پجاری تھے۔ انہیں بھی رسول کی عظمت و سروری، اسلام کی عزت و برتری اور مسلمانوں کا وقار عزیز نہیں تھا، بلکہ وہ مشرکین کی انجمن میں بیٹھیں یا مسجد کے صحن میں نظر آئیں ہر جگہ انہیں یہی روش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو رہا جماعت اسلامی کا چہرہ جو قاتلوں کی صف میں بالکل بے نقاب نظر آ رہا ہے، لیکن تبلیغی جماعت کا کردار بھی جماعت اسلامی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، صرف طریقہ کار کا فرق ہے، ورنہ بنیادی نصب العین کے اعتبار سے دونوں مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں، جماعت اسلامی کی دشمنی آج تنگی ہو گئی ہے، لیکن تبلیغی جماعت کی دشمنی دوستی کے پردے میں ہے۔

مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے فرار کا رویہ اختیار کر کے تبلیغی جماعت نے ہمارے

نوجوانوں کی قوت عمل کو مفلوج کر دینے کا جو منصوبہ تیار کیا ہے، وہ ہماری قومی زندگی کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے بے شمار مسائل ہیں جنہیں حل کیے بغیر ہم اپنے مستقبل کی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتے۔

ہماری نئی نسل کے لیے تعلیم کا مسئلہ، قانون کی دست برد سے مساجد و مقابر اور دینی مراکز کے تحفظ کا مسئلہ، مسلم پرسنل لاء کی بقا کا مسئلہ، انسداد فسادات کا مسئلہ، مسلمانوں کے معاشی وسائل کا مسئلہ، غرض بے شمار مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ تبلیغی جماعت کے لوگ کروڑوں روپے کے صرفے سے سال میں سیکڑوں اجتماعات کرتے ہیں، جن میں اشتہاری پروپیگنڈے کے مطابق دس دس لاکھ کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

لیکن آج تک کہیں یہ بات سننے میں نہیں آئی کہ انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل پر کچھ لب کشائی کی ہو، کوئی تجویز قوم کے سامنے رکھی ہو، حکومت سے کچھ مطالبہ کیا ہو، نہیں، بالکل نہیں!! کبھی نہیں!!! کبھی آپ نے غور فرمایا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اسلام رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے؟ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو صرف مسجد کا نمازی بنایا ہے؟ کیا صحابہ کرام کی زندگی کا یہی عملی نمونہ ہے؟

دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان اہل اسلام کی سلامتی و برتری کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد کیا قرآن کی نظر میں عبادت کا مقام نہیں رکھتا؟ ضرور رکھتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے لوگ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے؟

یقین نہ آئے تو آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں یا جن آبادیوں سے فساد کی قیامت گزر چکی ہے، وہاں کے لوگوں سے دریافت کر لیں۔ تبلیغی جماعت کے لوگ نہ مورچے پر نظر آئیں گے نہ مسلمانوں کے دفاع میں کوئی حصہ لیں گے، نہ ریلیف کے کام سے کوئی دلچسپی رکھیں گے اور نہ فساد کے انسداد کے سلسلے میں کسی اجتماعی مہم کا ساتھ دیں گے۔ سب سے زیادہ شرمناک رخ یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے لوگ اپنے اس طرز عمل پر نہ شرمندہ نظر آئیں گے اور نہ اپنی کوتاہیوں پر کسی افسوس کا اظہار کریں گے۔ پھر بھی سینہ تان کر کہتے ہیں کہ ہم دیندار

لوگ ہیں، ہمیں سوائے دین کے کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ سطرین سرسری طور پر پڑھ جانے کی نہیں ہیں، بلکہ ایک لمحے کے لیے آپ کو ٹھہر کر سوچنا ہے کہ کیا دین صرف مسجد میں تبلیغ لے کر بیٹھے رہنے کا نام ہے؟ کیا دین صرف کلمہ اور نماز پڑھنے اور پڑھانے کا نام ہے؟ اگر اسی کا نام دین ہے تو کروڑوں غازیان اسلام ہمارے معاشرہ میں کہاں سے پیدا ہوئے اور اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کے لیے سر فروشوں کی وہ ہزاروں میل لمبی قطاریں کیوں وجود میں آئی؟

آپ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں گے تو مسلمانوں کے خلاف دشمنان اسلام کی یہ خفیہ سازش آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ تبلیغی جماعت کا یہ ذہن اسلام کا عطا کردہ نہیں ہے، بلکہ یورپ اور امریکہ کے عیار دشمنوں نے ہمارے نوجوانوں کی قوت عمل کو مفلوج کر کے ہمیں پسپا، کنگال اور ذلیل کرنے کا جو خوفناک منصوبہ تیار کیا ہے، تبلیغی جماعت اسی منصوبے کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔

تبلیغی جماعت کے اعتقادی مفاسد اور مذہبی عیاریاں، گمراہیاں اپنی جگہ پر ہیں۔ ہو سکتا ہے اس رخ سے کچھ لوگ نوٹس لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کریں، لیکن اجتماعی مسائل کا تعلق تو صرف اہل سنت سے نہیں، بلکہ جو بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ اجتماعی مسائل کے اثر سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں اب سوال یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کی اس خطرناک تحریک سے ہمارے معاشرہ میں قوم دشمن راہبوں کا جو نیا گروہ پیدا ہوا ہے، اس کے زہریلے اثرات سے قوم کے سادہ لوح افراد کو بچانے کی ذمہ داری کیا صرف علمائے اہل سنت ہی کے سر ہے؟

تبلیغی جماعت کی اسلام دشمن تحریک سے اگر پوری قوم کا مستقبل تباہ ہو سکتا ہے تو اس تحریک کو کچلنے کے لیے پوری قوم کیوں نہیں آگے بڑھتی؟ قوم کے سیاسی رہنماؤں، خانقاہوں کے مصلحت اندیش درویشوں اور قلمی محاذ کے ذمہ دارو! جواب دو؟

(ماہنامہ جام نور، کلکتہ، جولائی ۱۹۷۹ء)

آخری کوشش

اہل سنت کے درمیان تنظیمی لامرکزیت اور دستوری قیادت کے فقدان کا ماتم ایک عرصہ دراز سے کیا جا رہا ہے، یہاں تک کہ اب ہماری سنجیدہ محفلوں کا موضوع سخن ہی یہ بن گیا ہے۔ جہاں تک جماعتی شیرازہ بندی کے لیے کوشش کا تعلق ہے، ہمارے اکابر نے متعدد بار اس کے لیے کوشش فرمائی۔ ملک کے طول و عرض سے جماعت کے ذمہ دار رہنما بھی جمع ہوئے، پر جوش امنگوں کے سائے میں کل ہند سطح پر جماعتوں کے تنظیمی ڈھانچے بھی تیار کیے گئے، لیکن ساری جدوجہد کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ یکے بعد دیگرے کل ہند سطح کی کئی تنظیمیں ہمارے یہاں وجود میں آ گئیں اور تماشہ یہ ہوا کہ کوئی تنظیم بھی اپنے لیڈر پیڈ، اپنے سائن بورڈ یا اپنے مخصوص حلقے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اس عجیب و غریب صورت حال کی اگر آپ وجہ دریافت کریں تو میں عرض کروں گا کہ ایک نہیں اس کی متعدد وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مسلمان کہلانے والے دوسرے فرقوں کی طرح ہم حال کے پیداوار نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ متواتر اور مسلسل روایات نے ہمیں آج کے دور میں منتقل کیا ہے۔ اس لیے اپنے حریفوں کی طرح ہمیں اس امر کی کبھی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ ہم مسلمانوں کو کسی نئے مذہب فکر سے منسلک کرنے کے لیے تحریک کے طور پر کوئی تبلیغی مشن چلائیں یا افراد کو مربوط رکھنے کے لیے کسی دستوری سطح کے جماعتی نظام کا سہارا لیں، بلکہ باہمی ارتباط اور اجتماعی رشتے کے لیے ہم نے ہمیشہ عقیدہ و عمل کی اس وحدت پر اعتماد کیا جو قدر مشترک کے طور پر کروڑوں افراد کے درمیان اسلاف سے وراثتاً منتقل ہوئی

تھی۔ جیسا کہ عہد حاضر سے پیش تر ماضی کے تمام ادوار میں دستوری سطح کے کسی جماعتی نظام کے بجائے صرف اعتقاد و عمل کی وحدت ہی کروڑوں مسلمانوں کے درمیان ارتباط و اجتماع کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی، برخلاف ہماری حریف جماعتوں کے، جنہوں نے الحاد کے لٹن سے جنم لیا ہے، کیونکہ ماضی میں ان کا کچھ نہیں ہے اس لیے انہیں مذہب سے لے کر لٹرچر تک اور قائد سے لے کر جماعت تک ہر چیز کا انتظام از سر نو خود کرنا پڑا۔ جب کہ ہمیں اس کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی، کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ ہمارے اسلاف کا دیا ہوا ہے اور وہ ہمارے لیے بہت کافی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کروڑوں افراد پر مشتمل کسی ملک گیر تنظیم کو چلانے کے لیے جن سیاسی وسائل اور وافر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں مفقود ہے۔ سیاسی وسائل کا مرحلہ تو اس لیے مشکل ہے کہ یہ میدان ضمیر، دیانت اور مذہبی احساسات کی قربانی چاہتا ہے اور یہ ایک برملا حقیقت ہے کہ ہمارا جماعتی مزاج اس طرح کی ایمان سوز قربانی کا قطعاً متحمل نہیں ہے، کیونکہ ہم دین کو قربان کر کے دین کی خدمت کا قطعاً کوئی تصور نہیں رکھتے۔ اب رہ گیا سرمایہ کا سوال تو آج کے دور میں اس کی فراہمی کے دو ہی راستے ہیں۔ پہلا راستہ تو سیاسی منڈیوں کے ہاتھ ”خود فروشی“ کا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں قابل فروخت کوئی جنس نہیں ہے، جس کے تبادلے میں ہم امریکہ کا ڈالر، یورپ کا پاؤنڈ اور سعودی عرب کا ریال حاصل کر سکیں۔

اب لے دے کے ہمارے لیے صرف عوامی تعاون کا ایک راستہ ہے جواب تک کھلا ہوا ہے، لیکن بد قسمتی سے اب تک ہم اس طرح کی خدمت کے لیے اپنے عوام کا ذہن ہی نہیں بنا سکے۔ تیسری وجہ ہمارے علماء کی انتہائی مصروف اور پابہ رکاب زندگی ہے، بالکل نسیم سحر کی طرح سبزہ و گل کو چھوٹی ہوئی گزر جانے والی اور جو تباہی کی طرح مسلسل رواں دواں..... ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک صوبے سے دوسرے صوبہ، ایک ملک سے دوسرے ملک، مشرق سے مغرب، جنوب سے شمال، زندگی بھر کا لگاتار سفر جو جلسہ گاہوں، کانفرنسوں اور اسٹیجوں کے گرد گھومتا رہتا ہے، اس جادہ نور دی اور شور الرحیل میں اتنی فرصت کہاں کہ جماعتی زندگی

کے مسائل کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور پھر ہزار جتن کے بعد کچھ لوگ بیٹھیں اور غور و فکر کے بعد کوئی منصوبہ بھی بنائیں تو اب اس کی تکمیل کا مرحلہ کون طے کرے؟ قائدین یا تو سفر میں ہیں یا اسٹیج پر یا پھر دوسرے سفر کے لیے پرتول رہے ہیں۔ ان حالات میں تنظیمی لامرکزیت اور جماعتی زبوں حالی کے اسباب کا اندازہ لگانا، اب کسی کے لیے بھی مشکل نہیں ہے۔

لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ ہم ساری رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود دستوری سطح کے کسی ملک گیر جماعتی نظام کی تشکیل کا مرحلہ ہمارے لیے قطعاً ناممکن ہے اور کیا ہندوستان جیسے جمہوری اور سیکولر ملک میں کوئی جماعت بھی بغیر تنظیم کے اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ کسی فعال اور متحرک تنظیم کو چلانے کے لیے متعدد قسم کے وسائل کی ضرورت ہے اور وہ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، لیکن اخلاص و ایثار اور نصرت خداوندی کے بھروسے پر اگر ہمارے علما اٹھ کھڑے ہوں تو کیا مشکلات کی یہ زنجیر ٹوٹ نہیں سکتی؟

سچ پوچھئے تو اغیار کی بہ نسبت ہمارے لیے جماعتی تنظیم کا کام بہت آسان ہے، کیونکہ کروڑوں اکائیوں میں ہمارے افراد پہلے ہی سے موجود ہیں، صرف انہیں ایک رشتے میں منسلک کرنا ہے۔ تنظیم نہ ہونے کے باعث ہم اجتماعی زندگی کے مسائل سے فرار کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہم قوم سے دن بدن دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ عوام کے ساتھ ہمارا رشتہ صرف اسٹیج ہی تک رہ گیا ہے اور اسٹیج پر بھی ہم دینی رہنما کے بجائے ایک چرب زبان خطیب، ایک پیشہ وروا عطا اور ایک فن کار مقرر کی حیثیت میں زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو قوم ہمارے اسلاف کے قدموں کے نیچے اپنا دل بچھاتی تھی آج وہ ہمارے ساتھ ایک فنکار کی طرح سلوک کر رہی ہے، اس لیے نہ ہی میری اپیلوں کا کوئی بھرم باقی ہے اور نہ ہی میری آواز میں کوئی کشش رہ گئی ہے۔ تنظیم کے بغیر ملک کے طول و عرض میں کروڑوں افراد کی بھیڑ رکھتے ہوئے ہماری تنہائی اور بے بسی کا ایک عبرت ناک واقعہ

ملاحظہ فرمائیے:

۲۶ مئی ۱۹۷۹ء آباد میں حضور مجاہد ملت علامہ محمد حبیب الرحمن صاحب قبلہ دامت برکاتہم القدسیہ نے انسداد فسادات کے موضوع پر غور و خوض کرنے کے لیے ملک کے اصحاب رائے کی ایک مجلس مشاورت طلب فرمائی تھی۔ اس مجلس میں سلطان المتکلمین حضرت علامہ شاہ مفتی رفاقت حسین صاحب قبلہ امین شریعت بھی تشریف فرما تھے۔

حضرت مجاہد ملت کے حکم پر میں بھی حاضر ہوا۔ حضرت نے بحث کے دوران انسداد فسادات کے سلسلے میں اپنا ایک فارمولا مجلس کے سامنے پیش کیا، جس کا متن یہ تھا:

فارمولا برائے انسداد فسادات: (۱) جہاں بھی فرقہ وارانہ فساد ہو وہاں کے ڈپٹی کمشنر، ایس ڈی او، ایس پی اور تھانے کے عملے کو فوراً معطل کر دیا جائے اور غیر جانب دارانہ تحقیقات کے بعد اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حکام نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مجرمانہ کوتاہی اور چشم پوشی سے کام لیا ہے تو جملہ متعلقہ افسران کو اپنی ملازمتوں سے بالکل برخاست کر دیا جائے۔

(۲) فساد پر قابو پانے کے لیے جہاں بھی باہر سے پولیس کا دستہ یا فوج کی کوئی کمپنی جائے، اس میں سنتری سے لے کر افسر تک دونوں فرقوں کے افراد کو برابر برابر نمائندگی دی جائے۔

(۳) جس محکمے، جس علاقے یا جس قصبے یا شہر میں، جس فرقے کی اکثریت ہو وہاں کے اکثریتی فرقے کے ذمہ دار افراد سے اس بات کا مکملکہ لیا جائے کہ وہ اپنے یہاں کی اقلیت کی حفاظت کریں گے۔ باہر کے حملہ آوروں کو اگر اخلاقی طور پر وہ خود نہ روک سکیں تو اس کے لیے پولیس سے کوئی مدد لیں تو قانوناً انہیں ہر طرح کی سزا کا مستوجب گردانا جائے۔ یہ بھی ان کا فرض ہوگا کہ اپنے علاقے کے سماج دشمن عناصر کو شرانگیزی سے باز رکھیں اور اگر وہ ان کا اخلاقی دباؤ محسوس نہ کریں تو انہیں پولیس کے حوالہ کریں۔

(۴) جہاں بھی فساد ہو وہاں کے متاثرین افراد کو جانی اور مالی نقصانات کا معقول معاوضہ دیا جائے، معقول معاوضہ سے مراد یہ ہے کہ جانی نقصان کا معاوضہ فی کس ایک لاکھ روپے کے حساب سے ان کے ورثہ کو دیا جائے۔ اس کے علاوہ مقتول کے خاندان کے

ذریعہ معاش کے لیے مقتول کے کسی وارث یا قریبی رشتہ دار کو روزگار بھی فراہم کیا جائے اور مالی نقصان کے معاوضہ سے مراد یہ ہے کہ جو بھی نقصان ہوا ہو اس کی بھرپور تلافی کی جائے۔ (۵) بلوائیوں اور بانیان فساد کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے کہ آئندہ کوئی شخص فساد برپا کرنے یا فساد میں حصہ لینے کی ہرگز ہمت نہ کر سکے، بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کے ملزمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ثبوت اور شہادت کے سلسلے میں ایسی قانونی چلک پیدا کی جائے کہ مظلوموں کی حق تلفی نہ ہو۔

مجلس شوریٰ میں حضور مجاہد ملت کا یہ فارمولا جزوی ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا گیا ہے، اب اس کے بعد یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس فارمولا کو مرکزی حکومت سے قانون کی حیثیت میں تبدیل کرانے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

حضور مجاہد ملت نے ارشاد فرمایا کہ ”ہماری حکومت احتجاج کی زبان کے علاوہ چونکہ سرکاری زبان سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے میں دہلی میں چالیس دن کا ایک جلسہ پر امن احتجاج کے لیے حاضر کر سکتا ہوں۔ مجلس شوریٰ کے ارکان نے مجاہد ملت کی اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے اس بات کا انہیں یقین دلایا کہ انسداد فساد کا یہ فارمولا لے کر جب وہ دہلی کی طرف مارچ کریں گے تو ملک و ملت کا حساس، وطن دوست اور انصاف پسند طبقہ ان کی تحریک کا پر جوش خیر مقدم کرے گا۔“

مجلس ختم ہوگئی اور اجمیر مقدس کے ارادے سے دوسرے دن ہم لوگ دہلی پہنچے وہاں حضرت مجاہد ملت کی ہمرکابی میں سلیم پور دہلی کے مولانا شاکر، باڑہ ہندوراؤ کے حاجی سلیمان اور یہ خادم، مولانا امداد صابری سے ملے اور انسداد فسادات کے سلسلے میں موصوف کو الہ آباد کی قرارداد سے باخبر کرتے ہوئے ان کا مشورہ طلب کیا۔ موصوف نے اس تجویز کی پر جوش انداز میں حمایت کی اور مشورہ دیا کہ تحریک شروع کرنے سے قبل سرگرم رضا کاران کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ملک میں مسلم رائے عامہ کو بیدار کرے، کیونکہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کے بنیادی تحفظ کے لیے جو تحریک چلائی جائے، اگر ایک لاکھ مسلمان بھی اس میں شریک نہ ہوں تو حکومت کی نظر میں اس

تحریک کا وزن ہی کیا رہے گا؟

یہ انقلاب انگیز تحریک اب تک کیوں نہیں شروع ہوئی؟ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دیا جاسکتا ہے کہ ہمارے یہاں کوئی فعال تنظیم نہیں ہے، چند مخلص قائدین ہیں تو ان کی زندگی اتنی رواں دواں اور مصروف ہے کہ اس طرح کی مہم کو چلانے کے لیے جتنی ہمہ گیر تیاریوں کی ضرورت ہے، اس کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔

امید کی ایک کرن: اسی موقع پر جب کہ انسداد فسادات کے متعلق کارروائی ختم ہوگئی تو میں نے اہل سنت کی تنظیمی لامرکزیت کی طرف اپنے اکابر کی توجہ مبذول کراتے ہوئے یہ عرضداشت پیش کی کہ اگر آپ حضرات کی زندگی میں کسی ایک جماعتی نظام پر ہم متحد نہیں ہوئے تو آنے والی نسلوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

ہماری درخواست کے جواب میں بزرگوں نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ اس طرح کی کوشش کئی بار کی جا چکی ہے اور سوائے ناکامی کے اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے پھر بھی یہ ضرورت اپنی جگہ پر ہے کہ آخری بار ایک کوشش اور کی جائے۔ بالآخر کافی دیر تک غور و خوض کے بعد طے پایا کہ مورخہ ۸ شوال المکرم ۱۳۹۹ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۷۹ء بروز ہفتہ جامعہ حبیبیہ الہ آباد میں ملک کے سارے مشاہیر علمائے اہل سنت کی ایک مجلس مشاورت طلب کی جائے، یہ بھی طے پایا کہ جملہ مشاہیر علمائے نام دعوت نامہ برہان الملت دامت برکاتہم، حضرت صاحب سجادہ سرکار کلاں کچھو چھو مقدسہ، حضرت صاحب سجادہ مارہرہ مطہرہ، حضرت مجاہد ملت، امین شریعت اور حضرت شمس العلماء دامت برکاتہم کی طرف سے جاری کیا جائے۔

اس کے ساتھ یہ خبر بھی اہل سنت کے لیے باعث مسرت ہوگی کہ کاپی کانفرنس کی واپسی میں خطیب مشرق مولانا مشتاق احمد نظامی، نائب مفتی اعظم ہند مولانا شریف الحق امجدی، بحر العلوم حضرت مولانا عبدالمنان صاحب، خطیب الہند حضرت مولانا سید مظہر ربانی سے جب میں نے اس پروگرام کا تذکرہ کیا تو ان کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے اور اس آخری کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے متفقہ طور پر طے کیا کہ یکم ستمبر کے اجلاس سے

پہلے ۳۰/۳۱ اگست کو دارالعلوم غریب نواز الہ آباد میں متوسط طبقے کے مشاہیر علمائے اہل سنت کا ایک اجتماع منعقد کیا جائے۔ جس میں اتحاد کا فارمولا، طریقہ کار اور متحدہ جماعت کا پروگرام طے کیا جائے اور اسے یکم ستمبر کو منعقد ہونے والے اکابر کے اجلاس میں پیش کیا جائے۔ خدائے قدیر ہماری کوشش کو کامیاب فرمائے۔

نوٹ: اہل سنت کی ایک فعال اور ہمہ گیر تنظیم کے مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے جملہ احباب اور علمائے اہل سنت سے میں اس اعلان کے ذریعہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس آخری کوشش کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں اپنے گرانقدر مشورے ارسال فرمائیں تاکہ انہیں الہ آباد کے اجلاس میں پیش کیا جائے۔

(ماہنامہ پاسان، الہ آباد، ستمبر ۱۹۷۹ء)

دو دو باتیں

علامہ ارشد القادری نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور جنرل سکریٹری کی علمی و دینی پستی کی جانب بروقت اور برجستہ جو نشانہ دی ہے وہ قابل صدمہ مبارکباد ہے، ادارہ ”المیزان“ علامہ کے مضمون کو آج اپنے ”اداریہ“ میں جگہ دیگر مولانا ندوی و مولانا رحمانی کی دینی بدیانتی کی مذمت کرتا ہے اور علامہ ارشد القادری کے احقاق حق کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(ایڈیٹر: المیزان)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خطبہ صدارت کا ایک

انتہائی قابل اعتراض حصہ

مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے انہوں نے نبی کے تشریحی اختیارات کا انکار کر کے مسلمانوں کی سخت دل آزاری کی ہے

۷ اپریل ۱۹۸۵ء کے روزنامہ ”اخبار مشرق“ کلکتہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے خطبہ صدارت کا یہ حصہ پڑھ کر سخت تکلیف پہنچی ہے۔ ”پیغمبر کو جب دین میں یہ حق نہیں تھا کہ وہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دے دیتے تو پھر کسی دوسرے کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ آسمانی دین میں ترمیم و تنسیخ کی آواز بلند کرے یا ایسا کرنے کا ارادہ کرے۔“ (اخبار مشرق، کلکتہ، صفحہ اول)

اور آزاد ہند کلکتہ کے سنڈے ایڈیشن ۱۷ اپریل کے ”جالا“ اخبار میں ان کی تقریر کا یہ حصہ ان لفظوں میں نقل کیا گیا ہے: ”نصوص اسلام میں کسی کو بھی ترمیم کرنے کا اختیار نہیں،

عام لوگ تو درکنار خود رسول کو بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی۔“ (آزاد ہند، کلکتہ، صفحہ اول) غور فرمائیے! ان عبارتوں میں کتنی صراحت کے ساتھ ندوی صاحب نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار فرمایا ہے اور دوسری زیادتی یہ ہے کہ رسول کو بھی عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ آج سے چند سال پیشتر رانچی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک علاقائی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی نے بھی انہی الفاظ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار کر کے مسلمانوں کی دل آزاری کی تھی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار کر دینے کے بعد، اب رسول کی حیثیت سوائے ایک ”نامہ بر“ کے اور کیا رہ جاتی ہے؟ رسول کے بارے میں یہ مسلک منکرین حدیث کا ہے، جسے اب مسلم پرسنل لا بورڈ والوں نے قبول کر لیا ہے۔ حلت و حرمت اور تشریحی احکام کے سلسلے میں رسول کو منجانب اللہ کوئی اختیار حاصل نہیں تھا تو انہیں چاہئے کہ اب وہ مسلم پرسنل لا کی بنیاد کے بارے میں صرف قرآن کا نام لیا کریں، حدیث یا سنت کا ہر گز ذکر نہ کریں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نے اپنے خطبہ صدارت میں رسول عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار کر کے مسلمانوں کو سخت قسم کے اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب ہمارے سامنے ایک نیا سوال یہ کھڑا ہو گیا ہے کہ ہم اسلام کے تحفظ کے لیے سب سے پہلے کس کے آگے صف آرا ہوں؟ حکومت کے سامنے جو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا ارادہ رکھتا ہے یا مسلم پرسنل لا بورڈ والوں کے سامنے جنہوں نے کلکتہ شہید مینار کے میدان میں صرف ترمیم ہی نہیں، بلکہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا، جب جڑ ہی پر تیشہ چلا دیا گیا تو اب برگ و بار اور شاخوں کے تحفظ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟

بار بار ہم حیرانی کے عالم میں سوچتے ہیں کہ ملک گیر گھن گرج کے ساتھ مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس کلکتہ میں کیا اسی مقصد کے لیے منعقد کیا گیا تھا کہ رسول عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کے وہ تشریحی اختیارات جو اللہ نے انہیں عطا کیے ہیں اور جن پر قرآن شہادہ عدل ہے اور جن کے بے شمار نمونے احادیث کے اوراق پر بکھرے ہوئے ہیں، انہیں منسوخ کر کے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی جائے؟

ہم اس دین کو ہرگز اسلام نہیں کہہ سکتے جس میں رسول کی اطاعت کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اطاعت کا سوال وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں دل میں کسی کے لیے حاکمیت کا تصور ہو۔ جب مسلم پرسنل لا بورڈ والوں کے نزدیک رسول کی حیثیت صرف ایک ”نامہ بر“ کی ہے اور شارع کی نہیں ہے تو ایک نامہ بر کی اطاعت کا مطالبہ نہ دین کا تقاضا ہے اور نہ عقل ہی کا، کیونکہ اطاعت ہمیشہ اُن احکام کی ہوتی ہے جو کسی اقتدار اعلیٰ کی طرف سے صادر ہونے کے باعث واجب التعمیل ہوں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا اقتدار ایک نامہ بر کے لیے کبھی نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ والوں کے سامنے شاید تصویر کا یہ دوسرا رخ نہیں ہے کہ اسلام میں ایسے بے شمار احکام موجود ہیں جن کا قرآن کے اندر کوئی ذکر نہیں ہے۔ اُن کی حرمت یا وجوب کی بنیاد صرف احادیث نبوی پر ہے، آج جس غلط جذبے میں یہ لوگ رسول عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار کر کے احادیث کی آئینی حیثیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں کل اگر مسلم پرسنل لا کے کسی حصے پر قانونی بحث چھڑ گئی اور اباب حکومت نے اس کی مذہبی حیثیت معلوم کرنے کے لیے اس کا ماخذ طلب کر لیا تو یہ حضرات کس طرح ثابت کر سکیں گے کہ یہ ہمارا ”مذہبی مسئلہ“ ہے، اس میں مداخلت نہ کی جائے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ والوں کی نظر میں جب خود پیغمبر ہی کی حیثیت قانون ساز کی نہیں ہے تو ان کے اقوال یعنی احادیث کی قانونی حیثیت کو کون تسلیم کرے گا؟ اب رہ گیا سوال فقہی مجموعہ قوانین کا، تو ظاہر ہے کہ جب رسول ہی کے اقوال کی تشریحی حیثیت ان حضرات کے نزدیک ناقابل تسلیم ہے تو ائمہ مجتہدین کے اقوال کا ان کے یہاں کیا اعتبار ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم پرسنل لا کے بہت سارے حصے صرف اس لیے قابل مداخلت قرار دے دیے جائیں گے کہ ان کی مذہبی حیثیت ثابت کرنے کے لیے ان حضرات کے پاس

کوئی آسانی دلیل نہیں تھی۔

آپ گہرائی میں اتر کر سوچیں تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نے ایک ہی جملے میں شریعت کے سارے نظام ترکیبی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے، حکومت کا خطرہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن کلکتہ شہید مینار کے میدان میں مسلم پرسنل لا کی جو نئی قبر کھودی گئی ہے، اس کا شکوہ ہم کس سے کریں۔ اب ہمارے مقدمہ کی نوعیت یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا میں حکومت کی طرف سے ترمیم کا خطرہ ہے اور یہ لوگ ترمیم کر چکے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کا انکار کرتے ہوئے قرآن کو بطور شاہد پیش کیا ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں نہایت صراحت کے ساتھ قرآن ہی کے حوالہ سے یہ ثابت کروں گا کہ مولانا نے جو کچھ کہا ہے وہ اُن کا اور اُن کے ساتھیوں کا تو عقیدہ ہو سکتا ہے، لیکن قرآن کا ہرگز نہیں۔ اب خالی الذہن ہو کر ذیل میں قرآن کریم کی وہ آیتیں ملاحظہ فرمائیں جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریحی اختیارات کو واضح طور پر ثابت کرتی ہیں۔

(۱) وَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ (پارہ: ۱۰، سورہ توبہ، رکوع: ۴، آیت ۲۹)

ترجمہ:- اور ان لوگوں سے جہاد کرو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔

اس آیت کے مفہوم پر اچھی طرح غور فرمائیے، اس آیت میں چیزوں کو حرام قرار دینے کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہے اور اللہ کے رسول کی طرف بھی۔ اگر اللہ کے رسول کو کسی چیز کے حرام قرار دینے کا اختیار نہیں تھا تو قرآن نے صراحت کے ساتھ ان کی طرف کسی چیز کو حرام قرار دینے کی نسبت کیوں کیا؟ ظاہر ہے کہ حرام قرار دینے کا سوال انہی چیزوں میں پیدا ہوتا ہے جو پہلے سے حلال ہوں، ورنہ جو چیزیں پہلے ہی سے حرام ہوں انہیں حرام قرار دینے کے کیا معنی؟

(۲) تورات میں پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جو نشانیاں مرقوم تھیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے:

يَا مَرْهَمَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (سورہ اعراف، رکوع: ۹، آیت: ۱۰۷)

ترجمہ: ”وہ انہیں بھلائی کا حکم دے گا اور برائی سے منع فرمائے گا اور ستھری چیزیں اُن کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں اُن پر حرام کرے گا۔“

اس آیت کریمہ میں بھی نہایت صراحت کے ساتھ اس امر کا بیان ہے کہ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حلال فرمانے اور حرام قرار دینے، دونوں طرح کا حق دیا گیا ہے۔

ان دونوں آیتوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس دعوے کو باطل اور غلط قرار دے دیا کہ ”پیغمبر کو جب دین میں یہ حق نہیں تھا کہ وہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دے دیتے تو پھر دوسرے کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا۔“

اب دوسری آیت میں اس امر کی صراحت ملاحظہ فرمائیے کہ پیغمبر کو اللہ کی عطا سے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ کسی حرام چیز کو حلال بھی قرار دے سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی قرآن میں اُن کا یہ اعلان نقل کیا گیا ہے۔

(۳) وَلَا حِلَّ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا (سورہ آل عمران، رکوع: ۵، آیت: ۱۰)

ترجمہ: ”اور میں اس لیے آیا ہوں تاکہ حلال کروں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو۔“

غور فرمائیے! اگر پیغمبر کو خدا کی طرف سے حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے کا اختیار نہیں تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہاں اعلان کیوں فرمایا اور قرآن نے اسے نقل کیوں کیا؟ اب مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دونوں دعوے قرآن ہی کی شہادت سے باطل ہو گئے اور قرآن ہی سے ثابت ہو گیا کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو دین میں یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ مصلحت

خداوندی کے مطابق حلال کو حرام بھی قرار دے سکتے ہیں اور حرام کو حلال بھی کر سکتے ہیں۔

یہاں تک تو آپ نے پیغمبر کے تشریحی اختیارات کا ثبوت قرآن سے ملاحظہ فرمایا۔ اب اسی مضمون پر ایک صریح حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے: مشہور صحابی رسول حضرت مقدم ابن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شعبان علی اریکنه یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوه وما وجدتم فیہ من حرام فحرموه وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: ”اچھی طرح بانبر ہو جاؤ کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے ساتھ ویسی ہی ایک اور چیز بھی۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا کہنے لگے کہ تم صرف قرآن کی پیروی کرو، جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جسے خدا کا رسول حرام قرار دے وہ ایسا ہی حرام ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔“

اس حدیث کے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ بات مسلم پرسنل لا بورڈ کے آسودہ حال لوگوں کے بارے میں کہی گئی ہو۔ اس میں بھی بالکل صراحت ہے اس امر کی کہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کو حرام قرار دینے کا اختیار رسول کو بھی دیا گیا ہے۔ بہر حال قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات بالکل اظہر من الشمس ہو گئی کہ رسول کے تشریحی اختیارات کے سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنے جس عقیدے کا اظہار فرمایا ہے وہ قرآن و حدیث کا نہیں، بلکہ ان حضرات کا خود اپنا عقیدہ ہے، جس کا اظہار وہ اپنی نجی محفلوں میں کرتے تو ہمیں آزادی رائے کے بے محل استعمال کا ہرگز شکوہ نہ ہوتا، لیکن مسلم پرسنل لا بورڈ کا اسٹیج مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کا مشترک اسٹیج تھا۔ وہاں انہیں کوئی ایسی اختلافی بات نہیں کہنی چاہیے تھی جس سے بورڈ میں شریک کسی بھی

جماعت کے مذہبی عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

واضح رہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ پر کسی ایک مکتب فکر کی اجارہ داری نہیں ہے، بلکہ اس کی تاسیس و قیام اور تشکیل و استحکام میں ہر مکتب فکر کے رہنماؤں نے کھل کر حصہ لیا ہے، چنانچہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں ممبئی کے ساحل پر مسلم پرسنل لا بورڈ کا جو سب سے پہلا کنونشن ہوا تھا، اُس میں تاجدار اہل سنت حضور مفتی اعظم ہند بریلی شریف کے حکم پر تین حضرات جماعت اہل سنت کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ جبل پور سے برہان الملت حضرت علامہ مفتی برہان الحق صاحب قبلہ، ممبئی سے مولانا نصرت اللہ عباسی اور جمشید پور سے یہ خاکسار ارشد القادری۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بھرے مجمع میں جہاں قاری طیب صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منت اللہ رحمانی وغیرہ سبھی موجود تھے، تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا تھا کہ اسٹیج پر جو چہرے نظر آ رہے ہیں، ان حضرات کے ساتھ ہمارے سنگین اختلافات کل بھی تھے اور آج بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم صرف اسی جذبے میں آج یہاں دوش بدوش بیٹھے ہوئے ہیں، تاکہ حکومت ہند کو یہ باور کرا دیں کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے جہاں دیوبند اور لکھنؤ سیدہ سپر ہیں وہاں بریلی نے بھی سر سے کفن باندھ لیا ہے۔

حضرت علامہ مفتی برہان الحق صاحب قبلہ اور مولانا نصرت اللہ عباسی خدا کو پیارے ہو گئے۔ یہ لوگ جب تک بقید حیات تھے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ ان حضرات کی وفات کے بعد اب تک ان کی جگہ پر علمائے بریلی میں سے کسی کو بھی بورڈ کی تنظیم میں داخل نہیں کیا گیا، کیونکہ اب مسلم پرسنل لا کی قیادت پر ایک گروپ کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے۔

میں اپنا یہ مضمون ختم کرتے ہوئے نہایت قلق کے ساتھ اس بات پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہوں کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریفی اختیارات کو چیلنج کیے بغیر کیا مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا نقطہ نظر واضح نہیں کیا جاسکتا؟ اب تو ہر حساس مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ جو لوگ منصب نبوت کے ساتھ اس طرح کا جارحانہ ذہن

رکھتے ہیں وہ مسلم پرسنل لا کا تحفظ کیا کر سکیں گے؟ کیونکہ مسلم پرسنل لا کا تحفظ بغیر منصب نبوت کے تحفظ کے ممکن ہی نہیں ہے۔

پیغمبر اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشریفی اختیارات کے ثبوت میں سر دست قرآن کریم سے صرف تین آیتیں اور کتب صحاح سے ایک حدیث میں نے پیش کی ہیں۔ اگر آئندہ ضرورت پیش آئی تو اس موضوع پر کتاب و سنت اور سلف صالحین کے ذخائر سے دلائل کے انبار جمع کیے جاسکتے ہیں۔

(ماہنامہ المیزان، ممبئی، مئی/جون ۱۹۸۵ء)

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم کے بھروسے پر اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ دعا کیجیے کہ راہ کی مشکلات قدموں کے لیے زنجیر نہ بن سکیں۔

شکست و نامرادی کی گزری ہوئی داستاں دہرانے کا کچھ حاصل نہیں ہے کہ یہاں ٹھوکر بھی اسی کو لگتی ہے، جو چلنا چاہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والوں کو نہ کانٹوں کی نوک سے کوئی شکوہ ہے اور نہ پتھروں کی چوٹ کا کوئی گلہ۔ جن لوگوں کو رسائل و جرائد کی طباعت و اشاعت کا کچھ بھی تجربہ ہے، وہ اس راہ کی حوصلہ شکن دشواریوں سے اچھی طرح واقف ہیں، لیکن ہزار مشکلات کے باوجود ضرورت بہر حال اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور ضرورت ہی کا تقاضا ہے کہ جس نے ہمارے اندر دوبارہ کھڑے ہونے کی سکت پیدا کی ہے، توفیق الہی کی رفاقت حاصل رہی تو ”رفاقت“ کو زندہ رکھنے کے لیے ہم کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ پندرہ روزہ ”رفاقت“ کو ماہ نامے میں تبدیل کر دینے کی وجہ بھی یہی ہے، تاکہ وسائل کی قلت کے باوجود اس کا تسلسل جاری رکھا جاسکے۔ خدا کا شکر ہے کہ رفاقت کی قلمی رفاقت کے لیے اسی شہر سے اعزازی طور پر چند اہل قلم ہمیں مل گئے ہیں جو حسن اعتقاد کے ساتھ حسن تحریر کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی رفقاء ادارہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں جناب سید شمیم صاحب منعمی صوفیائے بہار کی تاریخ کے بہترین اسکالر ہیں۔ قلم نہایت پختہ، ذہن رسا اور فکر نہایت بلند، ان کا ایک نہایت وقیع اور

جاندار مضمون اس شمارے کی زینت ہے۔

منزل کے نشانات: ”رفاقت“ کے سامنے ایک مقدس نصب العین ہے، جس کے گرد اس کی ساری قلمی کاوشیں گردش کرتی رہیں گی، ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے کہ جس طرح کے مضامین بھی دستیاب ہو جائیں ہم انہیں خانہ پری کے لیے چھاپ دیں۔ جن خطوط پر ہم اس ماہنامے کو چلائیں گے، اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

(۱) اسلام کے معتقدات و مسائل پر عقلی دلائل کی اشاعت (۲) اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی تصنیفات کو آج کی زبان میں منتقل کرنا (۳) دارالافتاء ادارہ شرعیہ بہار کے اقتباسات شائع کرنا (۴) مجلس طلبائے اسلام کی تحریک کو منظم کر کے نئی نسل کو قائدانہ صلاحیتوں سے مسلح کرنا (۵) علمائے اہل سنت کو جماعت کے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کرنا (۶) امت کے اکابر و اسلاف کے ساتھ مسلمانوں کو منسلک رکھنا۔ (۷) چمن چمن کے پھول کے عنوان سے کتابوں کا عطر کشید کرنا (۸) اس ملک میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لینا (۹) باطل افکار و عقائد کا محاسبہ کرنا (۱۰) اخبار رواں کے عنوان سے جماعتی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانا۔

تاریکیوں میں چراغ: سالہا سال کے تجربے میں ایک زندہ حقیقت کا مجھے سراغ لگا کہ تین ہی خدمت ایسی ہے جس کا نقش طویل عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ (۱) کسی زندہ فن پر کوئی وقیع و نادر کتاب لکھ دیجیے (۲) نور کے سانچے میں نئی نسل کا دماغ ڈھالنے والا کوئی تعلیمی ادارہ قائم کر دیجیے (۳) کسی کا ہاتھ تھام کر اپنا مرید بنا لیجیے۔ لاکھوں ڈیوڑھیاں ایسی ہیں، جہاں ہم نہیں پہنچ پاتے، لیکن ہماری کتاب پہنچ جاتی ہے۔ مصنف دنیا سے چلا جاتا ہے، لیکن اس کی کتاب اس کا نام زندہ رکھتی ہے۔ درخت کی شاخوں سے ٹوٹنے والے زرد پتوں کی طرح کتاب کے اوراق بھی بوسیدہ ہو جاتے ہیں، لیکن کوئی ناشر پھر انہیں نئے پیراہن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، لیکن اداروں کا وقار عمر کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ آدمی کی زندگی کسی نہ کسی پیمانے سے ناپی جاسکتی ہے، لیکن اداروں کی زندگی کی کوئی میقات نہیں ہے۔ آدمیوں کی اولاد انگلیوں پہ گنی جاسکتی ہے، لیکن تعلیمی اداروں کی پیداوار اعداد و شمار کی گرفت سے باہر ہے۔ ساری عمر شاگرد کے ساتھ دماغ

سوزی کیجیے، علم و حکمت کا سارا خزانہ اس کے سینے میں انڈیل دیجیے پھر بھی وہ آپ کا اپنا نہیں بن سیکے گا، لیکن صرف ایک بار کسی کا ہاتھ تھام لیجئے تو وہ ایک ہی لمحے میں عمر بھر کے لیے آپ کا غلام بن جائے گا اور غلام بھی خانہ زاد کہ نسل در نسل غلام۔ دوسروں سے کوئی بات منوائی ہو تو جب تک بات میں دلیل کا وزن نہ ہو کوئی نہیں مانے گا، لیکن مرید کے دل میں کسی بات کو اتارنے کے لیے دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پیر کی بات ہے۔
الحمد للہ! ہمارے یہاں ہاتھ تھانے والوں کی کمی نہیں ہے، البتہ قفق اس بات کا ہے کہ ہوا میں الفاظ کا لشکر اُتارنے والے نقش بر آب کے لیے تو سیما کی طرح بے قرار نظر آتے ہیں، لیکن نقش کا لجر کی طرح قدم بڑھانے کی انہیں توفیق نہیں ہوتی۔

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ امت کے اندر جس مذہبی فکر کو ایک ہزار سال تک برصغیر ہند میں محفوظ رکھا گیا، اسے ایک تعلیمی ادارے نے صرف سو برس کی محنت میں تہس نہس کر کے رکھا دیا اور جس دینی ذہن کو ہزار سال کی مدت میں لاکھوں اصحاب علم و تقدس اور کروڑوں ارباب عشق و عرفان نے تسلسل اور توراٹ کے ساتھ پروان چڑھایا، اسے دور جدید کے صرف ایک مصنف نے جگہ جگہ سے داغدار کر دیا۔

کیا ہمارے ذمہ دار علماء و خطبا سنجیدگی کے ساتھ اس خطرے کو محسوس کریں گے کہ ہمارا رابطہ اس طبقے سے ٹوٹ چکا ہے جس کے پاس سوچنے کا دماغ اور ملک پر اثر انداز ہونے کی قوت موجود ہے۔ ہمارے ساتھ صرف جذباتی اور سطحی ذہن رکھنے والے افراد کی بھیڑ ہے، جو صرف شعلہ بار الفاظ کی حرارت سے اپنا خون گرم رکھتے ہیں۔ اپنے مستقبل کا کوئی بلند تصور ان کے سامنے نہیں ہے۔ جماعتی زندگی کے لیے فکری صلاحیتوں کے فقدان کا الزام ان پر نہیں، ان کے قائدین پر ہے۔ آئندہ شماروں میں اس موضوع پر ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیلی مباحث آپ کے سامنے آئیں گے۔

دینی فروغ کی ایک بہت روح افزا کہانی ہے، جو آسام سے شروع ہوتی ہے اور بنارس اور سہارنپور ہوتے ہوئے نئی دہلی حضرت محبوب الہی کی چوکھٹ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ آنے والے شمارے میں آپ کی نگاہوں سے گزرے گی۔

(ماہنامہ رفاقت، پٹنہ، مارچ ۱۹۸۸ء)

درد کی کہانی، زخموں کی زبانی

۲۷ جنوری کو آٹھ ماہ کے طویل سفر سے اپنے وطن واپس آیا۔ اپنے قائم کیے ہوئے اداروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی، خصوصیت کے ساتھ ادارہ شرعیہ بہار کے ترجمان ماہ نامہ ”رفاقت“ کی دھڑکتی ہوئی نبض اور چہرے کی رونق و بشاشت سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ جس تندہی کے ساتھ ادارہ کے ناظم اعلیٰ محمد جان عالم خاں حبیبی، مخدوم زادہ شمیم معنی، عزیز القدر حبیب احمد سحر، مولانا غلام رسول بلیاوی، مولانا علی احمد سیوانی اور بہار کے صاحب طرز ادیب علامہ واقف نے ”رفاقت“ کو اپنے صوری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، میں ان سب کا شکر گزار ہوں اور سب کے لیے خیر و برکت اور فیروز مندی کی دعا کرتا ہوں۔

اس واقعہ کی اہمیت میری نگاہ میں اس لیے ہے کہ آج مسلمانوں کے اندر سے پر خلوص تعاون کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے بیمار معاشرے میں قبر کھودنے اور کیڑے نکالنے والے تخلصین کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ اب سکون و دل جمعی کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ طوفانوں سے لڑتے اور موجوں سے ٹکراتے ہوئے جو لوگ آگے بڑھتے ہیں وہی جانتے ہیں کہ ہاتھ میں پتوار لینے کی سزا کتنی دردناک ہوتی ہے۔ ستاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں سونے والوں کو کیا خبر کہ صبح امید کے انتظار میں کروٹیں بدلنے والوں پر کیا گزرتی ہے۔

وسائل کے بغیر آٹھ مہینے تک ”رفاقت“ کو صحت و سلامی کے ساتھ زندہ رکھنا، ہمارے رفقائے کاتبانہ کا نامہ ہے جس کی تحسین کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادارہ شرعیہ کے سارے شعبوں کو معمول کے مطابق زندہ و متحرک رکھنا اور کسی گوشہ سے بھی

یہ محسوس نہ ہونے دینا کہ میں یہاں موجود نہیں ہوں، واضح لفظوں میں سراہنے کی چیز ہے۔
سفر نامہ دیارِ فرنگ: میرے احباب اور عام مخلصین اہل سنت کو یہ معلوم کرنے کا بے حد اشتیاق ہے کہ اٹھ مہینے کے اس طویل سفر میں میری کارگزاریوں کا رواد کیا ہے؟ جو لوگ میری طبیعت کی افتاد اور میرے دینی جذبے کی پیتا بیوں سے واقف ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پامال زمین پر میں کبھی قدم نہیں رکھتا۔ میری مشکل پسند طبیعت اپنے جنون شوق کا تماشہ دیکھنے کے لیے وہی میدان تلاش کرتی ہے، جہاں سے کوئی قافلہ نہ گزرا ہو، جہاں تاریکیاں جیج رہی ہوں کہ یہاں ارشاد و ہدایت کا کوئی مینار قائم کیا جائے۔ کانٹوں کی نوک پر چلنا اگرچہ آسان نہیں ہے، لیکن اس کے بغیر ویرانوں کو چمن میں تبدیل بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔

سہارن پور، گواہٹی اور بنگلور میرے جنون انگیز مہم کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں، جہاں اہل سنت کا کوئی اپنا قابل ذکر مرکز نہیں تھا۔ خدا کی بندہ نوازی اور مصطفیٰ جانِ رحمت کی چارہ سازی سے اب زمین شر میں فصل اگ رہی ہے۔ خطہ نجد میں سیدی امام احمد رضا کے مسلک عشق و احترام کا جھنڈا گاڑنا پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالنا تھا، لیکن اعتماد علی اللہ کی تلوار ہاتھ میں ہو تو موانعات کی زنجیروں کو کاٹنے میں دیر نہیں لگتی۔

یورپ اسلام کے دروازے پر: یورپ کو اسلام کے دروازے پر کھڑا کرنے کی کہانی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اس کا پورا قصہ یوں ہے کہ ۱۹۸۳ء میں اپنے دوستوں کی دعوت پر میں ہالینڈ گیا۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ دو چار تقریریں کر کے اور اپنے معتقدین کا ایک محفوظ حلقہ بنا کر میں واپس لوٹ آتا، لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یورپ میں عیسائی مذہب کا زوال شروع ہو گیا ہے، یورپین اقوام کی نئی نسل عیسائی مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے، ان کے چرچ ویران ہو رہے ہیں، ان کی مذہبی درس گاہوں میں گرداڑ رہی ہے، ہر چیز کو عقل کے ترازو پر تولنے والے اب اپنے مذہب کو بھی عقل کے ترازو پر تول رہے ہیں۔ عیسائی مذہب کا یہ بنیادی عقیدہ ان کے حلق کے نیچے کسی طرح نہیں اتر رہا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ کر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ اب

ہر انسان کو پوری آزادی ہے کہ وہ بڑے سے بڑا گناہ کرے، سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کرے، جس طرح چاہے دنیا میں ظلم اور فساد پھیل جائے۔ خدا کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اس طرح اس عقیدے کی معقولیت کو بھی ان کی عقل نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ کلیسا کے پادری کے سامنے کوئی شخص اپنے گناہوں کی فہرست پیش کر کے اس سے اپنے گناہ معاف کرا لے تو خدا کے یہاں بھی اسے معافی مل جائے گی۔ اسی طرح عیسائی مذہب کی نو جوان نسل کے لیے یہ عقیدہ بھی ناقابل قبول ہو گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ بیٹے کا رشتہ بغیر بیوی کے کیوں کرو جود میں آسکتا ہے؟ عقل کی روشنی میں عیسائی مذہب کی بنیاد اب یورپ میں متزلزل ہوتی جا رہی ہے۔

اب یورپ کی سر زمین اسلام کی دعوت کے لیے سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی مادری زبانوں میں اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی جائے اور اس کام کے لیے سب سے پہلے ایسے داعیوں کا دستہ تیار کرنا ہوگا جو اسلام کی تعلیمات سے بھی واقف ہوں۔ اور یورپ کے اقوام کی مادری زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہوں۔

یہی سوچ کر میں نے ۱۹۸۳ء کے سفر میں جامعہ مدینۃ الاسلام کے نام سے دینی تعلیمات کا ایک عظیم مرکز ہالینڈ کی راجدھانی ہیگ میں قائم کیا اور اس کے لیے ایک تین منزلہ عمارت بھی خرید کر میں نے اس میں باضابطہ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ابتدا میں ہم نے پارٹ ٹائمز طلبہ سے، جو سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے، تعلیم کا آغاز کیا، چھٹی کے بعد شام کو وہ دو گھنٹے کے لیے جامعہ کی کلاس میں شریک ہوتے تھے۔ اردو اور ناظرہ قرآن کے درس کے ساتھ ساتھ ہم نے انہیں اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات سے روشناس کرانے کا سسٹم اختیار کیا جو ہر دن تیس منٹ تک جاری رہتا تھا۔

تعلیم کے ساتھ ان طلبہ کو ایک ترجمان کے ذریعہ ”اسلام انسان کا فطری مذہب ہے“ کے عنوان پر ڈچ زبان میں تقریروں کی مشق شروع کرائی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں میں اس موضوع پر نہایت موثر اور سلیجی ہوئی تقریر کرنے والوں کی ایک اچھی خاصی ٹیم تیار ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے ایک بہت بڑے جلسے کا انعقاد کیا۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ جو

طلبہ اس جلسہ کے مقرر تھے وہی اس کے منتظم بھی تھے۔ سامعین سے پورا ہال کچھ بھرا ہوا تھا، تین گھنٹے تک پندرہ طلبہ کی اتنی اثر انگیز اور جاندار تقریریں ہوئیں کہ لوگ محو حیرت رہ گئے۔ وہاں کے لوگوں پر جلسے کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ چند ہی دنوں میں ملک کے طول و عرض سے طلبہ کی اتنی زبردست بھیڑ جمع ہوگئی کہ جامعہ کی عمارت تنگ ہوگئی۔

اس جلسہ کی برکت کہیے کہ اس کے بعد فل ٹائمز طلبہ بھی ہمیں مل گئے، جو قیام و طعام کی سہولت کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق جامعہ کی عمارت میں ایک ہوسٹل کا قیام ہمیں عمل میں لانا پڑا۔ اس کے بعد نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا پورا نقشہ مرتب کر کے ہم نے جامعہ کی مینجنگ کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح نو مہینے کی مدت میں دینی تعلیم کا ایک نہایت مضبوط مرکز قائم کر کے ہم اپنے وطن واپس لوٹ آئے۔

جامعہ کی پہلی بہار اور یورپ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر: میری واپسی کے بعد میرے مقرر کردہ خطوط پر درجہ حفظ و تجوید کا قیام عمل میں آیا اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ساڑھے چار سال کی مدت میں ہالینڈ کے پانچ بچوں نے حفظ و تجوید کا نصاب مکمل کر لیا۔ جامعہ کی یہ پہلی بہار تھی جو اس دیارِ فرنگ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ داخل ہوئی۔ اس موقع پر جامعہ کی مینجنگ کمیٹی نے ان کی دستار بندی کا جشن نہایت شان و شوکت کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ۲۲ جون ۱۹۸۸ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ فاؤنڈر چیئرمین ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی اس جشن میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ ہندوستان میں اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود میں نے ان کی دعوت اس لیے قبول کر لی کہ اپنے فکری منصوبہ کے مطابق یورپ میں اسلام کی دعوت کے لیے مجھے ایک اہم قدم اٹھانا تھا۔

ہالینڈ کے لیے حفاظ کی رسم دستار بندی بالکل نئی چیز تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ یورپین اقوام میں بھی اس جشن کی دھوم مچ گئی۔ یہ بات سُن کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے کہ ۱۳-۱۴ برس کے ایک بچے نے قرآن جیسی ضخیم کتاب کو بالکل زبانی یاد کر لیا ہے۔ اسی حیرت زدگی کا کرشمہ تھا کہ جشن دستار بندی کے بعد ایک ڈیڑھ مہینے تک پریس، ریڈیو اور دیگر ذرائع

ابلاغ کے نمائندے جامعہ میں آتے رہے اور بچوں سے انٹرویو لیتے رہے۔ یورپ کے سارے خطوں میں اس تقریب کا نہایت پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ دینی تعلیم کے میدان میں اتنی عظیم الشان کامیابی کے بعد اب ہمارا حوصلہ بہت بلند ہو گیا اور ہم نے طے کر لیا کہ جامعہ میں حفظ و تجوید کے ساتھ ساتھ دین کی اعلیٰ تعلیم کا بھی سلسلہ شروع کیا جائے، تاکہ یورپ کی اقوام کو اسلام کی دہلیز پر کھڑا کرنے کے لیے یہاں سے ایسے علما پیدا ہوں جو ان کی مادری زبان میں اسلام کا آفاقی پیغام ان تک پہنچا سکیں اور اس طرح کے علما کی پیداواری کے لیے ہماری نظر میں سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ یورپ میں جن مسلمان بچوں کی مادری زبان انگلش، فرنچ، جرمنی اور ڈچ ہے، انہی بچوں کو عالم دین بنایا جائے۔ اس وسیع منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے ایک وسیع عمارت کی ضرورت پیش آئی، کیوں کہ جامعہ مدینۃ الاسلام کی موجودہ عمارت اتنے بڑے کام کے لیے قطعاً ناکافی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی ہمیں ایک نہایت وسیع اور شاندار عمارت مل گئی جو کیتھولک عیسائیوں کی کالج کی عمارت تھی۔ خدا کی غیبی امداد اور اس کے محبوب کی کار سازی پر بھروسہ کر کے ہم نے ساڑھے لاکھ میں اس کا سودا کر لیا اور کئی مہینے کی جدوجہد کے بعد ہم اس کی قیمت ادا کر کے اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ اب وہاں یورپ کے مختلف خطوں سے آنے والے طلبہ کے لیے ہوسٹل تعمیر کیا جا رہا ہے اور اعلیٰ تعلیم کا شعبہ قائم کرنے کے لیے قابل اساتذہ فراہم کیے جا رہے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ جس دن یورپ کے ملکوں میں فرنچ، انگلش، جرمن اور ڈچ زبان جاننے والے علمائے اسلام کی دعوت کی مہم شروع کریں گے وہ اسلام کی فتح و کامرانی کا نہایت درخشاں دن ہوگا۔

جنوبی امریکہ میں ایک دینی دارالعلوم کا قیام: اس سفر میں بیس دن تک ہم نے جنوبی امریکہ کا بھی دورہ کیا اور سورینام کی راجدھانی ”پاراماریبو“ میں ”دارالعلوم علیہ“ کے نام سے ایک اعلیٰ تعلیمی مرکز کی بنیاد رکھی ہے۔ امید ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ سورینام، برازیل، برٹش گویانا اور ویسٹ انڈیز کی ریاستوں میں اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلائے گا۔ پروگرام کے

مطابق زیر تعمیر ہوٹل میں نیویارک تک کے مسلم طلبہ کا داخلہ عید بعد سے شروع ہو جائے گا۔
ادارہ شرعیہ میں ائمہ مساجد کی تربیت گاہ کا قیام: ائمہ مساجد کی تربیت گاہ کے قیام کا منصوبہ ادارہ شرعیہ کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا، لیکن مناسب موقع کے انتظار میں طویل عرصہ گزر گیا۔ اب خدا کی توفیق سے ۲۵ فروری ۱۹۸۹ء کو ادارہ شرعیہ کی تیسری منزل کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ جیسے ہی مجوزہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچے گی اس منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

ائمہ مساجد کی تربیت مسلم معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت ہے، کیوں کہ مذہبی رہنماؤں کا جو طبقہ عوام سے سب سے زیادہ قریب رہتا ہے، وہ ائمہ مساجد ہی کا طبقہ ہے۔ دن اور رات میں پانچ بار کروڑوں افراد سے ان طبقہ کو ملنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس طبقہ کو اخلاق کی تسخیری قوتوں، انتظامی صلاحیتوں، ہدایت و اصلاح کی حکمتوں اور مذہبی قیادت کے تقاضوں سے مسلح کر دیا جائے تو نہایت آسانی سے پورے ملک کے مسلمانوں میں ایک خاموش روحانی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ ۵ فیصد ائمہ مساجد رکوع و سجود کے سوا منصب امامت کے تقاضوں سے قطعاً نااہل ہیں۔ منصب امام کی فنی تربیت کے ذریعہ اگر اس طبقہ کی صلاحیتوں کو نکھار دیا جائے تو مسلم معاشرہ کے لیے یہ فرشتہ رحمت ثابت ہو سکتا ہے۔ امامت کے لوازمات اور مفید معلومات پر مشتمل ایک جامع نصاب کی تربیت کا کام بھی زیر غور ہے۔

بہار میں سنی علماء و علمائے دین کے لیے ایک لمحہ فکریہ: بہار کی حکومت اس بات سے اچھی طرح باخبر ہے کہ عقیدہ و مسلک کی بنیاد پر مسلمانوں کے اندر کئی فرقے ہیں اور ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق برابر ہیں۔ مثال کے طور پر بہار میں مسلمانوں کی دو متوازی تنظیمیں ہیں، ایک ادارہ شرعیہ دوسری امارت شرعیہ۔ ادارہ شرعیہ ان مسلمانوں کے احساسات و روایات کی نمائندگی کرتا ہے جو میلاد و قیام اور عرس و فاتحہ کے پابند ہیں اور جنہیں اہل سنت کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے اور بلاشبہ وہ پوری ریاست میں عددی اکثریت کے حامل ہیں۔

لیکن نہایت قلق اور افسوس کے ساتھ ہم اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ بہار حکومت نے کلیۃً انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ جن سرکاری اداروں کا تعلق مدارس اور مساجد کے نظم و نسق سے ہے ان میں ادارہ شرعیہ کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی ہے۔ ہر جگہ امارت شرعیہ ہی کے لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر بہار کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں امارت کے ممبران کافی تعداد میں ہیں کہ بورڈ کی میٹنگ میں شریک ہونے سے پہلے وہ پھلواری شریف میں اپنے ہم خیال ممبران کی میٹنگ کر کے یہ طے کر لیتے ہیں کہ بورڈ کی میٹنگ میں انہیں کس طرح اپنے فرقہ وارانہ اور طبقاتی مفادات کا تحفظ کرنا چاہئے۔ بہار صوبائی سنی وقف بورڈ میں بھی ادارہ شرعیہ کا کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا، حالانکہ بہار کے طول و عرض میں اتنی بڑی تعداد میں اہل سنت کے مدارس اور مساجد ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

ان حالات میں اہل سنت کے علماء و علمائے دین کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے مدارس اور مساجد کے لیے ان خطرات کو محسوس کریں جو بالکل یقینی ہیں۔ واقعات و تجربات شاہد ہیں کہ ہمارے مذہبی حریفوں نے وقف بورڈ کے ذریعہ اپنا محکمہ جاتی اثر و رسوخ استعمال کر کے پہلے ہماری مسجدوں کی انتظامیہ کے خلاف اپنے آدمیوں سے وقف بورڈ میں فرضی شکایات داخل کروائیں، پھر انکو آئری کمیشن کے ذریعہ نئی کمیٹی بنوا کر ہمیں ہماری مسجدوں سے بے دخل کر دیا۔ اس طرح کی تاریخ یہ لوگ بہار میں بھی دہرانا چاہتے ہیں۔

ملحقہ مدارس کا حال بھی آپ حضرات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مصنوعی کمیٹیاں بورڈ سے منظور کروا کر کس طرح ہمارے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے ہمیں بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے بے شمار مقدمات بورڈ میں زیر سماعت ہیں۔

اب بھی اگر ہمارے رہنماؤں کو ہوش نہیں آیا اور انہوں نے اس امتیازی سلوک کے خلاف آواز بلند نہیں کی تو دس بیس سال میں نہ کوئی مسجد ہمارے قبضہ میں رہ جائے گی اور نہ کسی ملحقہ مدرسہ میں ہمارا کوئی عمل دخل رہے گا۔

ہمارے ساتھ یہ ظلم اور زیادتی اور ہمارے خلاف بہار کے دینی مراکز سے ہمیں بے دخل کرنے کی یہ ساری سازش ان نام نہاد مسلم وزراء کی تحریک پر وجود میں آتی ہے جو عقیدہ ان کے

ہم نواہیں۔ غیر مسلم وزیروں کو تو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگی ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان مسلک اور عقیدے کا اختلاف کیا ہے؟ اس لیے احتجاج کی پوری طاقت ان نام نہاد مسلم وزیروں کے خلاف صرف کی جائے جنہوں نے ہماری حق تلفی کر کے انصاف کا خون کیا ہے۔

(ماہنامہ رفاقت، پٹنہ، مارچ ۱۹۸۹ء)